دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی: شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (مغربی پاکستان)

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد : ۵
شمارہ : ۶

محرم الحرام ۱۳۹۰
مارچ ۱۹۷۰ء

الحق

ماہنامہ اکوڑہ خٹک

مدیر ——— سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک | مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے، فی پرچہ ۷۰ پیسے۔ غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ
غیر ممالک ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

رسوائے زمانہ عائلی قوانین کا آرڈیننس دورِ ایوبی کا وہ سیاہ ترین دھبہ ہے جو اب تک ملت مسلمہ پاکستانیہ کے نورانی ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ اور ہم سب کے حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی کیلئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ اسکی تجویز اور تنفیذ سے لیکر اب تک علماء حق اور غیور جمہور مسلمانوں نے متفق ہو کر اس پر احتجاج کیا۔ اس کے غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہونے پر مدلل اور مفصل رائے ظاہر کی۔ چند حیا باختہ اور یورپ زدہ افراد کو چھوڑ کر عفیف اور پاکدامن عورتیں بھی اسکی قباحت پر متفق ہیں، پھر صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں بھی اس پر ہمہ گیر نفرت کا اظہار اور اسکی تنسیخ کی سفارش کی گئی ہے۔ ایوب کے اختلاع اور عزل کی تحریک کے دوران کوئی ایسا عوامی مظاہرہ نہیں ہوا جس میں ان قوانین پر نفرت وملامت نہ کی گئی ہو۔ ان قوانین کی تمام دفعات تعددِ ازدواج پر پابندی۔ نکاح کے لئے عمر کی تحدید، طلاق اور عدت کے مسائل میں ردو بدل، پوتے کی وراثت وغیرہ میں کوئی ایسی دفعہ نہیں جو قرآن وسنت اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے فقہی نظام سے جوڑ کھا سکتی ہو جسکی بناء پر نئی حکومت کی معتدلانہ پالیسی اور عوام کے دینی جذبات کی رعایت کے پیش نظر مسلمانوں کو بجا طور پر توقع تھی کہ صدر یحییٰ خان کی حکومت ان قوانین کو پیش رو حکومت کی طرح نام نہاد ترمیمی کمیٹیوں کے سپرد کر کے ٹالتے رہنے کی بجائے اسے یکلخت منسوخ کرنے کا آرڈیننس جاری کر دے گی۔ مگر افسوس کہ اس بارہ میں مایوسی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ حال ہی میں ان قوانین پر غور و فکر اور ترمیم کے لئے جس ایڈوائزری کونسل کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اس سے ان خدشات کو اور بھی سہارا مل جاتا ہے کہ نئی حکومت ان قوانین کے بارہ میں یا تو عوامی احساسات سے آگاہ نہیں، یا پھر وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیکر اُسے ٹالنا چاہتی ہے۔ تاہم اگر ایڈوائزری کونسل اب بھی ان قوانین کے بارہ میں صاف دل ہو کر ملک بھر کے تمام علماء اور عامۃ المسلمین کے مسلسل اور ہمہ گیر احتجاج، اختلافی نوٹس اور متبادل تجاویز کو سامنے رکھ کر ان قوانین پر غور کرے تو وہ بہت جلد اس کی تنسیخ کے دانشمندانہ فیصلہ تک پہنچ سکتی ہے۔ فیملی لاز پر مسلمانوں کا جو ردِعمل اب تک ظاہر ہوتا چلا آرہا ہے۔ ایڈوائزری کونسل کو وہ پورا ریکارڈ مہیا کر کے اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔
اسلام نے عائلی اور ازدواجی زندگی کیلئے جو عادلانہ اور منصفانہ اصول مقرر کئے ہیں، اگر انہیں صحیح

شکل میں نافذ کر دیا جائے تو گھریلو مسائل اور مرد و عورت کی باہمی زندگی کی تمام پیچیدگیاں خود بخود کافور ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کا مرحلہ موجودہ فیملی لاز کی تنسیخ کے بعد کا ہے۔ عائلی قوانین پر غور کرنے والی کمیٹی کو دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ موجودہ عائلی قوانین کا مجموعی حیثیت سے غیر شرعی ہونے پر قرآن و سنت پر عبور رکھنے والے علماء کے کسی گروہ میں بھی دو آراء نہیں پائی جاتیں اور نہایت منقح اور ہر طرف سے واضح طور پر دلائل کی روشنی میں موجودہ قوانین پر تنقیدیں سامنے آچکی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ موجودہ قوانین سے ملک کی باشعور اور حیادار خواتین کو بھی اتفاق نہیں۔ اس میدان میں اگر کچھ کہا جا رہا ہے تو وہ "اپوا" کے نام سے چند بازاری قسم کی عورتیں ہیں جن کی عادات و اطوار اور شبانہ روز مشاغل؛ اخلاق، عفت اور اسلام کیلئے ایک گالی بن کر رہ گئی ہیں۔ یا پھر ہماری محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خان ہیں جو کبھی ان خواتین کو اینگلو محمڈن لا کا نعم البدل قرار دیتی ہیں۔ اور کبھی یہ کھسیانی بلی اس طرح کھمبا نوچتی ہے کہ علماء اب تک ان قوانین کے بارہ میں کیوں خاموش تھے ۔؟ بیگم صاحبہ عمر کے آخری دور میں ہیں۔ مگر طور طریقے جوانوں کے سے دکھلا رہی ہیں۔ کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ پاکباز خواتین کے حقوق کے نام پر وہ انکی عفت اور عظمتوں کا جنازہ نکال رہی ہیں اور دوسری طرف وہ آخر دم تک اپنے قابل احترام شوہر نامدار کی نیک نامی پر بھی چھینٹے ڈالتی جا رہی ہیں۔ ہمیں اس سلسلہ میں محترمہ بیگم آغا محمد یحیٰی خان صاحب (جنہیں چند ماہ قبل دارالعلوم حقانیہ آمد کے موقع پر حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہٗ نے عائلی قوانین کے غیر فطری اور غیر اسلامی ہونے پر تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر وہ ایسے امور میں بہترین اسلامی کردار ادا کر سکیں تو انہیں تاریخ میں زبیدہ مرحومہ بیگم ہارون الرشیدؒ جیسا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔) سے بھی گذارش کرنی ہے کہ انہیں اس سلسلہ میں اپنے سلجھے ہوئے ذہن پاکیزہ احساسات اور اہم حیثیت سے کام لیکر اس دینی فریضہ سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے اور عورتوں کے حقوق کے نام پر "اپوا" کے نام سے جن غیر شرعی اور غیر اخلاقی حرکات کا مظاہرہ ہو رہا ہے اس کا سدّباب کرنا چاہیئے وہ اور اُن جیسی چند ایک ذمہ دار خواتین اگر چاہیں تو اپنی مساعی سے خواتین کو اللہ اور اس کے رسول کے دیئے ہوئے حقوق اور صحیح مقام دلوا سکتی ہیں۔ اور عورت کا صحیح مقام یہی ہے کہ وہ شمع محفل نہ ہو، رونق خانہ ہو، متاع عیش و نشاط نہ ہو، عفت اور عصمت کا آبگینہ ہو، بندگانِ ہوائے و ہوس کے گلے کا طوق نہ ہو۔ ماں بہن اور بیوی کی شکل میں مرد کی عظمتوں کا تاج ہو۔ ان گذارشات کیساتھ ہم ایک بار پھر موجودہ حکومت سے مخلصانہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ موجودہ عائلی قوانین کا معاملہ مشاورتی کونسلوں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی متوقع اسمبلیوں پر نہ چھوڑے

بلکہ مومنانہ قدم اٹھاکر انہیں یکلخت منسوخ کر دے۔

راقم الحروف کو اس دفعہ کئی امور پہ خامہ فرسائی کی خواہش کے باوجود بعض اشغال اور عوارض کی وجہ سے دلجمعی اور یکسوئی سے لکھنے کا موقع نہ مل سکا، اس سلسلہ میں سفینۂ عرفات سے جانے والے حجاج کرام کو جس اندوہناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا وہ پورے عالم اسلام کیلئے سنجیدہ غور و فکر کا مستحق ہے، مغربی تہذیب کی رَو میں ہم ایسے بہہ گئے کہ ہمارا دل و دماغ ہر معاملہ میں اسی ڈگر پر سوچنے لگا ہے مسبب الاسباب پر بھروسہ جاتا رہا اور اسباب کے گورکھ دھندے میں ایمان و خرد کی تمام گتھیاں الجھ کر رہ گئیں۔ اسلام امراض کی تعدیت کے نظریہ کا اس حد تک بہرحال روادار نہیں کہ چند ایک آفت رسیدہ افراد کی وجہ سے ہزار بارہ سو مسلمانوں کو بیت اللہ کی آغوش میں فریضۂ حج سے محروم کر دیا جائے۔ اس مسئلہ پر ماہنامہ الحق کے سرپرست حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے ایک مجلس میں اپنے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں انہیں مولانا شیر علی شاہ مدرس دارالعلوم نے اپنے الفاظ میں ضبط کیا ہے جسے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

"عرفات کے بابرکت میدان میں رحمت کائنات محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر لاکھ سے متجاوز نفوس قدسیہ کو یہ اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام رسوم کو میں نے یہاں روند دیا ہے۔ آئندہ مسلمانوں کو صرف اسلام اور دین کی پیروی کرنا ہوگی۔ جاہلیت کے اس عقیدہ کو کہ" امراض کے اندر تعدی ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقعہ پر اس طرح باطل قرار دیا کہ لاعدوی ولاطیرۃ[1] اگر موجودہ دور کا مسلمان اس عقیدہ پر قائم رہتا تو آج تقریباً تیرہ سو[13] زائرین حجاز تڑپ تڑپ کر حج کی سعادت سے محروم نہ رہتے۔ ان مظلوم حجاج کی بے تابانہ نگاہیں ان مقدس پہاڑوں پر پڑ رہی تھیں جس کے درمیان بیت اللہ شریف کا مقدس و نورانی بقعہ ہے، ان کے کان گذرنے والے لاکھوں حجاج کی تکبیروں کی آوازیں، لبیک کی صدائیں سن رہے تھے۔ مگر افسوس کہ حکومت کی بے بصیرتی اور تغافل نے ان بے دست و پا دور افتادہ مسلمانوں کے دیرینہ تمناؤں اور دلی خواہشات کو جدہ کے صحرا میں دفنا دیا۔ طرہ یہ کہ وہ آغوش حرم میں مناسک حج سے محروم کر دئے گئے۔ اس جانکاہ منظر کا احساس وہی کر سکتا ہے جسکو حرمین شریفین کی دید کا جذبہ اور تڑپ دیار حبیب کو کھینچ رہا ہو۔

واقرب مایکون الشوق یوماً   اذا دنت الخیام الی الخیام

تاریخ میں یہ عظیم سانحہ رہتی دنیا تک ذمہ دار افراد کی قساوت اور شقاوت کا بدنما داغ رہے گا۔ اگر یہ

---

[1] اسلام میں امراض کی تعدی اور بدفالی وغیرہ نہیں۔

غفلت شعار حکام ^دسویں کی^ رات کو بھی ان حجاج کو عرفات پہنچا دیئے تو ان کا فریضہ ادا ہو جاتا۔ پاک وہند میں اسلام کی ترویج واشاعت کی ایک اہم وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب بھی ہندوستان کے شہروں یا قصبوں میں طاعون یا ہیضہ کی بیماری پھیلتی تو وہاں کے مقامی ہندو اپنے گھروں اور شہروں میں اپنے بیماروں کو چھوڑ کر دور بھاگ جاتے تھے اور مسلمان اپنے پختہ عقائد اور بلند اخلاق کی بنا پر اپنے گھروں میں رہ کر ان ہندو بیماروں کی خدمت کرتے رہتے۔ جب وہ بیمار ہندو شفایاب ہو جاتے تو بے اختیار وہ مسلمان ہو کر کہتے کہ جو مذہب زندگی کے نازک اوقات میں اپنے پیروکاروں کی ہمدردی واعانت چھوڑ دیتا ہے، وہ موت کے بعد ہماری کیا امداد کرے گا۔ یہ عجب انصاف ہے کہ سفینۂ عرفات میں چند حاجی چیچک میں مبتلا ہوئے، اور ان کی وجہ سے تیرہ سو مشتاقانِ حج کو سعادتِ حج سے محروم کر دیا گیا۔ اوّلاً تو چاہیئے تھا کہ اسلامی عقائد کے ماتحت ان مریضوں کو بھی اجازت دے دی جاتی۔ بصورت دیگر ان کو قرنطینہ میں رکھ کر بقیہ حجاج کو مناسک حج کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ کیا رسولِ خدا نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جذامی مریض کیساتھ کھانا نہیں کھایا ہے۔؟ اور اسی نبویؐ سنت پر عمل کرتے ہوئے فاروق اعظم حضرت عمرؓ نے مجذوم کے ساتھ ایک ہی برتن سے کھانا کھایا۔ اور فرمایا: کُلْ ثِقَةً بِاللهِ۔ اور اگر بالفرض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے ایمان بچانے کی خاطر فِرَّ مِنَ المجذوم پر عمل مقصود ہے تو پھر مریضوں کو قرنطینہ میں رکھتے نہ کہ تمام تندرستوں کو بھی حج سے محروم کر دیتے۔ اگر چیچک میں دوسروں تک متجاوز ہونے کا اندیشہ تھا، اور یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں سب لوگ اس بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں، تو یہ محض وہم وگمان تھا، کیوں کہ وہ باقی سب کے سب اب تک بحمداللہ چیچک سے محفوظ ہیں تو بقیہ حجاج میں سرایت وتعدی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان ودیگر ممالک میں ہمیشہ چیچک وغیرہ کی بیماری رہا کرتی ہے۔ ہر گھر میں دو ایک بچے بیمار رہتے ہیں تو پھر تمام پاکستانیوں کا قرنطینہ کرنا چاہیئے تاکہ چیچک نہ پھیلے، ایسے عقیدہ سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ یہ غیر مسلموں کا عقیدہ ہے۔ اسی نظریہ کی وجہ سے مسلمانوں میں مریضوں کے ساتھ ہمدردی نہ رہی تھی جس کا اثر یہاں تک پہنچا کہ اب عبادات بھی اس کے زد میں آگئیں۔

حدیث شریف میں ہے لاعدوی۔ کہ امراض میں تعدی نہیں ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے کیلئے نہ علت ہے نہ سبب، جیسا کہ ایک اعرابی نے کہا کہ ایک خارشتی اونٹ کیوجہ سے دوسرے اونٹ بھی خارشتی ہو جاتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا فَمَنْ اَجْرَبَ الْاَوَّلَ۔؟ پہلے کو کس نے خارشتی بنا دیا؟ جس قادر مطلق ذات نے پہلے اونٹ کو مرض

میں مبتلا کیا اس نے دوسرے کو بھی اس مرض میں مبتلا کر دیا۔ اگر ایک مرض متجاوز ہونیکے لئے علت مان لی جائے۔ تو معلول کا وجود علت کے ساتھ لازمی ہے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں طاعون وغیرہ امراض پھیل جاتے ہیں تو وہاں دس فیصدی بیمار ہو جاتے ہیں۔ اور نوّے فیصدی محفوظ رہتے ہیں۔ جیسے گذشتہ طاعون کی رپورٹ سے ظاہر ہے اور فرّمن المجذوم (جذامی سے بھاگ جا) کا حکم محض ضعیف الاعتقاد لوگوں کے دین کو محفوظ رکھنے کی خاطر ہے۔ مگر زیر بحث قضیہ میں تو تندرستوں کو حج سے روک دیا گیا اور جرم یہ بتاتے ہیں کہ ان پر بیماروں کی ہوا لگی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مرض علت تو نہیں مگر سبب ہے، تو اس صورت میں بھی تندرست حجاج کو روکنا جائز نہیں بطور مثال آگ ہلاکت کا سبب ہے۔ یا پیٹرول کو آگ لگنے سے قیامت خیز مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ تو پھر آگ یا پیٹرول، ماچس وغیرہ کو گھر میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہئے پانی میں بہت سے لوگ ڈوب کر مرجاتے ہیں، یا کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ لوگ آگ یا پیٹرول پانی یا کنوئیں کا قرنطینہ نہیں کرتے۔

الغرض اسلام نے ہمیں تعلیم دی کہ تمام مخلوق بالخصوص مریض سے ہمدردی سے پیش آؤ۔ عیادت تیمارداری کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اگر تعدی کا وہم مسلمانوں میں پھیل گیا تو پھر یہ مریضوں کے علاج و معالجہ اور خدمت سے غافل ہو جائیں گے۔ صد افسوس کہ وہم جاہلیت کا غلبہ و تسلط اتنا بڑھ گیا کہ مراکز دین کے خدام نے بھی اسطرف توجہ نہ کی کہ اسلام نے جس چیز کو بیخ و بن سے کاٹا تھا۔ اسکی تصدیق ہم کیوں کر رہے ہیں، حالانکہ سعودی حکومت ایک وقت توحید اور اللہ پر بھروسہ کی اتنی دعویدار بنی تھی کہ شریعت کے حدود میں ہر جائز اسباب اور وسائل کے ارتکاب کو بھی شرک قرار دیتی تھی۔ مگر اب معاملہ الٹا ہو گیا، ضروری ہے کہ ان مظلوم حجاج کی حالت زار پر رحم و کرم فرماتے ہوئے ان کے روکنے اور ٹیکوں کے غلط اندراج کرنے والوں کا مؤاخذہ و محاسبہ کر کے ان حجاج کو آئندہ سال کرایہ اور زرمبادلہ کی پوری سہولت مفت مہیا کیا جائے اور مکمل سہولتوں کے ساتھ فریضہ حج کی سعادت بہم پہنچائیں جبکہ حکومت نے ان کے حج کو قضا کر کے ان پر آئندہ قضا لازم کر دی ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند
★
ضبط و ترتیب : سمیع الحق

دین اور شعائر دین کا احترام

دین میں ادب کی اہمیت اور اختلاف رائے کے حدود

دین اور شعائر اللہ کے احترام اور اختلاف رائے کے حدود اور فرق مراتب ملحوظ رکھنے کے بارہ میں حضرت حکیم الاسلام کے حکیمانہ ارشادات کا پہلا حصہ دسمبر کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت اس کا بقیہ حصہ پیش خدمت ہے، امید ہے کہ گذشتہ قسط کیطرح اسے بھی نہایت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ " س "

★

بہر حال دین کا دار و مدار تادبات پر ہے۔ یہ شریعت کا مستقل باب ہے یہاں احکام ہیں وہاں اس کے ساتھ کچھ آداب ہیں۔ تو ادبیات پر اگر آدمی قادر نہ ہو تو وہ اصل احکام سے بھی کورا اور محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے آداب کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے غالباً ایک حدیث نقل کی ہے، جس کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں، مگر نقل کئے دیتا ہوں۔ تفسیر فتح العزیز میں ہے:

من تھاون بالآداب حرم من السنۃ ومن تھاون بالسنۃ حرم من الواجبات ومن تھاون بالواجبات حرم من الفرائض ومن تھاون بالفرائض حرم من المعرفۃ۔	جس نے آداب پر عمل میں سستی دکھلائی وہ سنت سے محروم ہو گیا، جس نے سنت میں سستی دکھلائی وہ واجبات سے محروم ہو گا جس نے واجبات ادا کرنے میں سستی کی فرائض سے محروم ہو گا۔ اور جس نے فرائض میں کوتاہی کی وہ اللہ کی پہچان سے محروم ہو گا۔

فرائض پر عمل کرے گا تو معرفت بڑھے گی۔ اس واسطے سنتوں کو مکمل فرائض کہا گیا۔ تو جس نے آج سنتیں

چھوڑ دیں۔ صرف فرائض کو پڑھ لیا تو کل وہ بھی نہ پڑھے گا۔ رفتہ رفتہ محروم ہو جائے گا۔

آداب اور مکروہات کی حیثیت شریعت میں احکام کی دو قسم ہیں۔ مامورات یعنی کرنے کی چیزیں، تو اس کے لئے تو آداب رکھے گئے کہ انہیں کرو گے، تب جا کر مامورات پر عمل نصیب ہو گا۔ اور ایک ہیں منہیات، تو روکنے کی چیزوں میں مکروہات رکھے گئے، کہ مکروہات سے بچو گے۔ تب حرام سے بچنا نصیب ہو گا۔ اور اگر مکروہات میں ڈوبے رہو گے تو ایک نہ ایک دن حرام میں پڑ جاؤ گے۔ اور اس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں سدّ ذرائع کہا جاتا ہے، یعنی ذرائع اور وسائل کو روک دو تاکہ مقاصد تک آدمی نہ پہنچ سکے۔ تو منہی اور ممنوع چیزوں میں وسائل سے بچانا تاکہ اصل ممنوع سے بچ جائے اور واجبات میں وسائل کو اختیار کرنا تاکہ فرائض پر عمل نصیب ہو اسے کہتے ہیں سدّ ذرائع۔

سدّ ذرائع کی مثالیں مثلاً حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہٗ حرامٌ۔ جس چیز کے زیادہ حصہ میں نشہ ہو اس کا کم حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کے ایک گھونٹ میں نشہ ہے ایک قطرہ میں تو نہیں، لیکن قطرہ پینا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح گھونٹ پینا حرام ہے حالانکہ حرمت تو سُکر کی وجہ سے ہے، اور ایک قطرہ میں ظاہر ہے کہ سُکر نہیں، مگر سدّ ذرائع کے لئے ایسا کیا گیا کہ جو ایک قطرہ شراب پی لے گا تو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا۔ اور جو کل ایک گھونٹ پیئے گا تو پرسوں پورا جام پیئے گا، اور شرابی بن جائے گا۔ تو شرابی بننے سے بچانے کیلئے قطرہ کو حرام کیا تاکہ وہاں تک پہنچنے نہ پائے یا جیساکہ حدیث میں ہے کہ من اطاع عرّافاً فقد کفر بما انزل علیٰ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کسی جادوگر یا کاہن کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر کفر کیا۔ حالانکہ جادوگر کے پاس جانے سے توحید و رسالت اور قیامت سے انکار نہیں ہوتا، کوئی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی مگر پھر بھی فرماتے ہیں کہ کفر کیا اس نے شریعت اسلام کے ساتھ۔ اس لئے کہ آج جو جادوگر کے پاس گیا، تو سحر کی برائی اس کے دل سے نکل گئی تو کل کو اس کا سحر سیکھے گا، اور پرسوں پورا جادوگر بن جائے گا، تو اسی جادو کے کفر سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے کی ممانعت کر دی گئی، اس کو کہتے ہیں، سدّ ذرائع، اصل مقصود کو کبیرہ گناہ کہتے ہیں اور وسائل کو صغیرہ گناہ۔ تو وسائل سے روکتے ہیں تاکہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے، مثلاً چوری کرنا کبیرہ گناہ ہے کہ کسی مال معصوم کو آدمی بلا اس کی مرضی کے اٹھا لائے لیکن یہ تو ہے اصل خرابی مگر اس کی وجہ سے کسی کے مال کو تاک جھانک کرنا، نقب لگانا، دیوار سے جھانکنا یہ سب

مقاصد ہیں اور اس لئے ناجائز ہیں کہ جب یہ کرے گا تو ایک دن اصل حرام بھی کر بیٹھے گا۔ گو اپنی ذات سے کسی کے سامان کو دیکھنا، کسی کی دیوار کو تاک لگانا تو ممنوع چیز نہیں مگر اس لئے ممنوع ہوئے کہ یہ وسیلہ بنتے ہیں چوری کے، یا مثلاً زنا کے سلسلہ میں اصل ممنوع ہے وہ فعل مگر اس سے بچانے کے لئے نامحرم عورت سے تخلیہ کرنا، اس پر نگاہ ڈالنا اس کی آواز پہ کان دھرنا، ہاتھ سے چھونا، سب ممنوع قرار دیا گیا، اس لئے کہ یہ چیزیں اصل حرام فعل کے ذرائع بنتی ہیں۔ تو شریعت نے چاہا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دواعی سے بھی بچو یہ سب آداب ہیں شریعت کے۔

عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں | مامورات میں نماز فرض ہے اس فرض کو بجالانے کیلئے کچھ چیزوں کا اہتمام کیا گیا کہ اذان جب سنو تو اس کا جواب دو تاکہ اذان سنتے ہی فکر پیدا ہو جائے کہ اب مجھے نماز کو جانا ہے۔ اس کے بعد وضوء کا اہتمام کرو، پھر ترغیب دی گئی کہ مسجد میں جاؤ گے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک بدی مٹا دی جائے گی۔ حالانکہ قدم رکھنا تو اپنی ذات سے کوئی عبادت نہیں، لیکن نماز کیلئے قدم رکھنا عبادت قرار دیا گیا، اس لئے کہ یہ قدم ذریعہ بنے گا نماز پڑھنے کا۔ تو اذان کا جواب دینا، قدم اٹھانا، وضوء، استنجاء اور طہارت وغیرہ کی فضیلت آئی حتیٰ کہ بعض اہل اللہ کی تو یہ شان سنی، حضرت حاجی امداد اللہ کا واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا

بزرگوں کو نیکیوں کی حرص | کہ اگر مسجد کے دو راستے ہوں ایک ذرا لمبا راستہ اور ایک مختصر راستہ تو لمبا راستہ اختیار کرتے اور فرماتے کہ جتنے قدم زیادہ پڑیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی، اتنی بدیاں مٹیں گی۔ تو کیوں ہم محروم رہیں، اور ساتھ میں قدم بھی رکھتے چھوٹے چھوٹے یعنی بالطبع چال سے کم چال سے چلتے کہ قدم اٹھانے پر اجر کا وعدہ ہے، تو یہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ جتنے چاہیں قدم رکھیں۔ تاکہ اتنی نیکیاں لکھی جاویں۔ تو سو قدم سے اگر مسجد تک پہنچتے تو آہستہ آہستہ چل کر انہیں دو سو قدم بنا دیتے — اور یہ حضرات نیکیوں پر حریص ہوتے ہیں۔ جیسے دنیا والے دنیا کے بارہ میں، کہ انہیں سو مل جائے تو ہزار اور ہزار مل جائیں تو لاکھ اور لاکھ مل جائیں تو کروڑ کی تمنا اور حرص ہوتی ہے۔ تو یہ اللہ والے دین کے بارہ میں ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ایک ثواب ملتا ہے تو اس پر قناعت نہیں، دو مل جائیں تو تیسرے کی خواہش۔

امام ابوداؤد کا واقعہ | امام ابوداؤد بہت بڑے محدث ہیں، وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے، کنارے پر پانی کم تھا۔ ایک جہاز دو سو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، کنارے تک آ نہیں سکتا تھا۔ تو جہاز میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے الحمد للہ کہا اور اتنے زور سے

کہ ان کے کان میں آواز آئی۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جواب یرحمک اللّٰہ کہہ دینا چاہیے مگر یہ مسئلہ مجلس سے متعلق ہے یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں الحمد للّٰہ کہے تو تم گھر سے جواب دینے جاؤ۔ امام ابوداؤدؒ کے کان میں آواز پڑی الحمد للّٰہ کی، تو یہ لوگ نیکیوں کے حریص تھے چھوٹی سی نیکی ملنے کا امکان ہو تو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ نیکی اور خیر کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ تو جہاز دور تھا، آواز پہنچ نہیں سکتی تھی، تو تین درہم میں کشتی کرایہ پر لی۔ اس میں بیٹھ کر جہاز کے اوپر چڑھے، وہاں جا کر کہا یرحمک اللّٰہ۔ تو ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز کان میں آئی کہ اسے ابی داؤد آج تین درہم میں تو نے جنت کو خرید لیا۔ حالانکہ امام کتنے بڑے محدث، کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے تہجد پڑھے کتنے جہاد کئے ہوں گے۔ مگر جنت کی خریداری میں بڑے بڑے عمل کا نہیں بلکہ ذکر آیا تو یرحمک اللّٰہ کہنے کا جو بظاہر بہت چھوٹا اور معمولی سا عمل تھا مگر کیوں آیا۔؟ اس لئے کہ ایسے اخلاص سے عمل کیا کہ اس چھوٹے سے عمل میں اتنا وزن پیدا ہوا کہ بڑے بڑے عمل میں اتنا نہ ہو گا۔ اور اللّٰہ کے ہاں عمل کی صورت نہیں وزن دیکھا جاتا ہے۔ تو کشتی لے کر جہاز پر جا کر یرحمک اللّٰہ کہنا نہ فرض تھا نہ واجب۔ مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص ہوتے ہیں۔ تاکہ فرائض پر عمل میں کوتاہی نہ آئے۔ تو تادب مع اللّٰہ اتنا ضروری ہے۔

اختلاف کرنے والے کو معذور سمجھا جائے اس زمانہ میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں، فرقہ بندی زیادہ ہو گئی، تو ایک دوسرے کے حق میں زبان طعن و ملامت اور زبان تضحیک کھولنی بہت معمولی بات بن گئی۔ اسواسطے میں نے یہ سمع خراشی آپ لوگوں کی کی کہ اگر بالفرض اختلاف آبھی جائے کسی عالم سے تو اگر آپ خود عالم ہیں تب تو آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متبع ہیں۔ اور وہ اختلاف کر رہا ہے، دوسرے عالم کا تو عمل کریں اپنے مقتدی و متبوع کی تحقیق پر مگر دوسرے کے ساتھ تمسخر کرنا آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی حجت ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی مگر وہ جو کہتا ہے تو عند اللّٰہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ اگر خطا ہو جائے تو پھر بھی اُسے اجر ملتا ہے۔ اور آپ اس پر عتاب اور عذاب بھیجنے لگیں تو یہ تو خدا کا مقابلہ ہو گیا، حق تعالیٰ کے ہاں اجتہاد کی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ تو آجکل مسخرہ پن بڑھ گیا ہے، فروعی اختلافات کی وجہ سے اور یہ دین کے منافی ہے۔ بیشک آدمی عمل کرے اپنی تحقیق پر اور معذور رکھے دوسرے کو۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرز عمل | ائمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعیؒ بغداد تشریف لائے اور امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو امامؒ کا مسلک ہے نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعیؒ کے ہاں زور سے کہنا افضل و اولی ہے۔ مگر جب امام شافعیؒ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا مجھے حیا آتی ہے اس صاحب مزار سے کہ اس کے قریب آکر اس کے اجتہاد سے خلاف کروں یہ ادب و تادب ہے۔ یعنی جس حد تک گنجائش ہو ایک تو فرق ہے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا کہ ایک کے ہاں جائز دوسرے کے ہاں حرام اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کرسکتے مگر جہاں اولی اور غیر اولی کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جاسکتا ہے تو امام شافعیؒ نے افضل پر عمل ترک کرایا اور غیر افضل پر عمل کیا امامؒ کی رعایت سے، حالانکہ امام ابو حنیفہؒ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں، مگر یہ ادب کا عالم تھا، اور یہ ادب اور تادب کی بات تھی۔

مسائل اور نفسانی جذبات | حضرات صحابہؓ کے درمیان بھی اختلافات تھے ائمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں وہ صحابہؓ میں بھی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ادب و احترام اور عظمت و تعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی اس لئے کہ ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ مسائل کی خاصیت نہیں ہے بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں، ہم نے مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے اپنے جذبات نکالنے کا۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہؓ لڑتے کیونکہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا اس کے بعد ائمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی، پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ تو در اصل اختلاف رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات کو نکالتے ہیں۔ اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز تو اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے، جب مسلمانوں کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں، نہ جائیداد نہ مکان نہ سلطنت۔ تو سوچا کہ بھئی دین کو ذریعہ بناؤ لڑنے کا۔ اور مسائل کو آڑ بناؤ، تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں، اختلاف کرنے کی تو گنجائش ہے مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

عیسائی جج کا طنز | آج سے تیس چالیس سال پہلے ایک یورپین عیسائی کلکٹر تھا تو اس کے زمانہ میں احناف اور اہل حدیث میں لڑائی ہوئی اور لڑائی آمین کہنے پر ہوئی۔ حنفیوں نے آہستہ پڑھی اہل حدیث نے زور سے کہی تو لاٹھی چل گئی، بہت سے لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ گیا

کلکٹر کے ہاں، فریقین کے وکلاء نے کلکٹر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی آمین کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں۔؟ تو وکلاء نے کہا کہ نہیں آمین ایک قول ہے زبان سے نکالتے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ سے حدیث آئی ہے کہ آمین زور سے پڑھو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے کہ آہستہ پڑھو۔ اس نے کہا جسکو جو حدیث معلوم ہے اس پر عمل کرے، تم لڑتے کیوں ہو۔ اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے کی بات بھی نہ تھی۔

آمین بالشر | بہرحال اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی شکل دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک آمین بالجہر زور سے پڑھنا۔ ایک آمین بالسر آہستہ پڑھنا۔ اور ایک ہے آمین بالشر یعنی جھگڑنے لڑنے کے لئے پڑھنا۔ اس لئے کہ پہلے دونوں کے بارہ میں تو حدیث موجود ہے۔ ایک کو ایک امام نے دوسرے کو دوسرے نے اختیار کر لیا تو اس میں لڑائی کی بنیاد ہی نہیں ——— یہ آمین بالشر کی لڑائی ہے، لہذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتلایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لئے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لئے، وہ تو دیانۃً حجت سے رائے قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ تو یہ تو ہمارے قلوب کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات کا آڑ بنا لیا ہے۔ اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا اور گروہ بندیوں کیلئے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں آپ کا فریضہ | اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے وہ اپنی قبر میں جائے گا، اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے۔ کیوں اس سے مسخرہ کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزا کرے۔ آپ نے بیان کیا تو حق ادا ہو گیا امر بالمعروف کا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عند اللہ جواب دے، تم ذمہ دار نہیں، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا۔ اور پھر دین منوانا (یعنی اس پر کسی کو مجبور کرانا) بھی ضروری نہیں چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا بھی ضروری ہو۔ بہرحال آجکل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

شیخ عبدالقادرؒ کی نصیحت | حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں مقام کو جا کر دین کی تبلیغ و اشاعت کرو، چلتے چلتے مرید نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمائیے مجھے۔ شیخؒ نے فرمایا کہ دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ

مت کرو اور نبوت کا دعویٰ مت کرو۔ وہ حیران ہوا کہ حضرت میں بیسوں برس آپ کی صحبت میں رہا کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ تھا کہ میں نبوت اور خدائی کا دعویٰ کروں گا۔ فرمایا کہ خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو پھر بات کرو۔ خدا کی ذات وہ ہے کہ وہ جو کہہ دے وہی اٹل ہو اس سے اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ تو جو انسان اپنی رائے کو اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اٹل ہو اس کے خلاف نہ ہو سکے تو بندہ اپنی رائے پر اتنا اصرار کرے تو اس سے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ کیا ہوگا۔ اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے وہ سچی بات ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ تو جو شخص اپنے قول کے بارہ میں کہے کہ یہ اتنی سچی بات ہے کہ اس کے خلاف ممکن نہیں تو وہ درپردہ گویا مدعی ہے نبوت کا۔ کہ میری بات غلط نہیں ہو سکتی، حالانکہ اسکی رائے ہے۔

فساد یا اصلاح؟ — تو ایک شخص اجتہادی رائے کے بارہ میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں فساد ہے۔ تو ایک چیز کو چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکیدار نہیں ہو ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چلاتے رہنا اس سے خواہ مخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آگئی۔

تبلیغی اور ترجیحی مسائل میں فرق — ہاں ایک ہیں دین کے اصول نماز فرض ہے، روزہ رکھنا زکوٰۃ دینا فرض ہے، آپ زور سے کہہ سکتے ہیں، لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہیں نہیں کہ آپ زور کہاں سے دیتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذاہب ہی نہیں کہ آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو تم حنفی بن جاؤ اور شافعی مت بنو یا شافعی کہے کہ لوگو شافعی بن جاؤ حنفی مت بنو۔ یہ ترجیحی مذاہب ہیں تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے، اور فلاں عمل نہیں تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذاہب مت بناؤ۔ کہ اگر کسی عالم کو کوئی جزئی تحقیق ہو تو خواہ مخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔

بہرحال آجکل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے، بہت گستاخی، جسارت اور جرأت ہو رہی ہے۔ اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرما دے عمل کی۔

اللهم افتح لنا بالخير واختم لنا بالخير

(نوٹ) اس تقریر کی ٹیپ مہیا کرنے پر ہم برادر محترم قاری سعید الرحمان صاحب اور محترم جناب نذیر احمد صاحب وزارت مالیات کے ممنون ہیں۔

حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ
شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

خداوند تعالےٰ

کے وجود پر

سائنسی دلائل

اسلام کے بنیادی اصول اور سائنس

سائنس اور اسلام پر حضرت مولانا کے اس محققانہ مقالہ کی دو قسطیں ستمبر اور اکتوبر کے پرچہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب حضرت مولانا نے اس کا باقی حصہ بھیجا ہے جو پیش خدمت ہے۔

اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں۔ ۱۔ ثبوت باری اور توحید۔ ۲۔ نبوت۔ ۳۔ معاد اور مجازات اعمال۔ ان تینوں امور پر ہم بحث کریں گے کہ کیا ان میں سے کوئی بنیادی عقیدہ ایسا ہے جو سائنس اور قوانین قدرت کے خلاف ہے۔

۱۔ خدا کا ثبوت تاریخی اور فطری حیثیت سے ۱۔ خدا کا اعتراف انسان کی اصلی فطرت میں داخل ہے۔ علم الانسان کے ماہرین نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ انسان جب فطری حالت میں تھا، یعنی علوم و فنون کا بالکل وجود نہ تھا۔ اس وقت انسان نے حقیقی خدا کی پرستش کی یا مصنوعی خدا کی۔ مادیین (مٹیریلسٹ) کے سوا تمام محققین نے فیصلہ کیا کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش کی تھی۔ مشہور محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ جسمانی خدا (بت) اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ فطرت اصلی مثالی صورت کے پردہ میں چھپ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں خدا کا اعتقاد موجود تھا۔ آشوری، مصری، کلدانی، اہل فینیشیہ سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صنعت و حرفت نہ دولت لیکن ایسا

کوئی قوم نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو۔ والٹیر فرانس کا مشہور فاضل جو وحی اور الہام کا منکر تھا، کہتا ہے۔ کہ منو سولن سقراط سسرو سب ایک سردار ایک منصف اور ایک بُت کی پرستش کرتے تھے۔ (مالینسوتھر کی کتاب الفلسفہ ترجمہ عربی مطبوعہ بیروت ص۱۷۵) ۲۔ فطری امور کی جانچ کے لئے بڑا اصول یہ ہے کہ تمام اقوام عالم میں ایک امر جب مختلف اور گوناگوں امتیازات کے رنگ میں موجود ہو۔ تو ان خصوصیات کے حذف کر دینے کے بعد جو قدر مشترک رہ جائے وہی تمام اقوام کی فطرت ہے۔ مثلاً تمام اقوام میں کھانے پینے پوشاک مکان رہائش اور بیاہ شادی کے ڈھنگ اور طور طریقے مختلف ہیں۔ اور ان کے طرز و شکل الگ الگ ہیں جب ہم ان خصوصیات کو حذف کر دیتے ہیں۔ تو سب اقوام میں مشترک چیز نفس کھانا پینا کپڑا پہننا لباس مکان شادی و نکاح باقی رہ جاتا ہے۔ اس لئے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نفس کھانا پینا لباس مکان شادی انسان اور اقوام عالم کی فطری ضرورتیں ہیں۔ اسی طرح اقوام عالم میں خدا کا عقیدہ مختلف رنگوں میں موجود ہے۔ کوئی مجرد خدا مانتا ہے۔ کوئی مجسم خدا (بُت) مانتا ہے۔ کوئی ایک خدا مانتا ہے کوئی متعدد جو منکر خدا ہے وہ مادہ اور اس کی حرکت کو منشاء کائنات یا بالفاظ دیگر خدا مانتا ہے جب ہم ان سب خصوصیات کو حذف کر دیتے ہیں۔ تو نفس خدا کا عقیدہ قدر مشترک رہ جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی عقیدۂ تصور خدا انسان کا فطری عقیدہ ہے۔ اور تسلیم خدا فطرت کی خاموش آواز ہے۔

۳۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ صانع اور اس کے مصنوعات کے، مادہ اور ملبہ میں فرق کرتا ہے۔ اور مادہ اور ملبہ ذریعۂ کار سمجھتا ہے لیکن کارساز نہیں سمجھتا مثلاً ایک عمارت جس مادہ اور ملبہ سے تیار ہوتی ہے۔ انسان اس کو تعمیر کے لئے کافی نہیں سمجھتا بلکہ ایک وجود کو عمارت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ کائنات کی عظیم عمارت کا بھی یہی حال ہے کہ وہ صرف مادہ اور ملبہ سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کے لئے ایک حکیم دانا معمار کی ضرورت ہے اسی معمار خدا ہے۔ جس کا عقیدہ فطرت کا تقاضا ہے۔

۴۔ پچھلے تین سو سال کی سائنسی کاوشوں نے انسان کو کائنات کے متعلق جس مادی نظریہ کی تشکیل کے قابل بنایا وہ یہ ہے کہ کائنات مادہ اور حرکت مادہ کے مختلف مظاہر کا نام ہے۔ اور کسی بیرونی قوت کو اس میں دخل نہیں اور کائنات ایک وسیع مشین ہے جسکی توجیہہ اجزائے مادہ کی حرکت سے ہوتی ہے۔ نیوٹن۔ ڈارون اور لامارک اسی توجیہہ کو حقیقت ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک

کہ ذہن وغیرہ تو خالص غیر مادی حقائق ہیں جنکی نہ کمیت ہے نہ وزن اور نہ حجم رکھتے ہیں۔ ان کو بھی انہوں نے بیسویں صدی کی تحقیقات کے تحت مادہ کا اثر اور نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ مشکل وہ ابھی تک حل نہ کر سکے کہ عالم ایک وسیع مشین ہے لیکن ان کے قوانین میں توافق و تناسب ہے جو ایک مقصد کی تکمیل کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ توافق ان اجزائے عالم میں کہاں سے پیدا ہوا یہ کہنا لغو ہے کہ یہ ان اجزاء کی طبعی خاصیت ہے اور یہ توافق ان اجزائے مادہ سے خارج چیز ہے۔ بلکہ یہ توافق ایک بالاتر قوت نے ان میں پیدا کیا۔ جو ان تمام قوانین قدرت پر حاکم ہے وہی خدا ہے۔

۵۔ اجزائے مادہ کی حقیقت ایک ہے لہذا ان اجزا کی مقتضیات اور خاصیات بھی ایک جیسے ہوں گے۔ اب ان اجزاء نے اگر بیرونی قوت کی مداخلت کے بغیر بے شمار اجسام عالم اور انواع کائنات کی جو شکل اختیار کی ان میں کثافت، لطافت، شکل و خاصیات کے جو نمایاں امتیازات موجود ہیں۔ یہ امتیازات کہاں سے آئے اگر کہا جائے کہ ان اجزائے مادہ کے ربط باہمی میں تعدد اجزاء اور باہمدگر قرب و بعد اور ترتیب اجزائے عالم کی مختلف انواع وجود میں آئیں تو بعض چیزوں میں اجزائے مادہ کی خاص تعداد اور مخصوص طرز اتصال اور ممتاز ترتیب سے مرتب ہونا ان اجزاء کی ذاتی خاصیت نہیں، ورنہ سب اجزاء میں ان تین امور کی یکسانیت موجود ہوتی اور ان سے پھر صرف ایک قسم کا جسم موجود ہوتا۔ کیونکہ اجزاء مادہ بھی ایک ہیں مذکورہ تینوں خواص بھی ایک ہی مادہ کی خاصیات ہیں تو پھر اجسام عالم میں یہ اختلاف و امتیاز کہاں سے آیا۔ بجز اس کے کہ حاکم کائنات کے دست قدرت سے یہ اختلاف نمودار ہوا اور وہی ذات اس اختلاف کا اصل عامل ہے۔

۶۔ اجزائے مادہ متحرک ہیں۔ ہر متحرک کے لئے محرک ضروری ہے۔ یعنی حرکت کنندہ کیلئے حرکت دہندہ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ محرک بھی متحرک ہو تو اس کے لئے ایک اور محرک کی ضرورت ہوگی۔ اس صورت تسلسل اور لامتناہی کا وجود لازم آئے گا جو محال ہے اور جب عالم کے کل اجزاء اور اسی طرح اجزائے مادہ متحرک ہیں تو ضرور ان کا محرک ایسی ذات ہوگا جو متحرک نہ ہو اور وہ مادیات سے ماوراء ہوگا اور ایسی شے صرف ذات خداوندی ہے۔

۷۔ مادیات میں تنوع و تکثر پایا جاتا ہے۔ یہ بقول ڈاروِن وغیرہ اگر ارتقا کا نتیجہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجزائے مادہ میں ارتقاء کا یہ خاص تصور کہاں سے پیدا ہوا اور کیوں پیدا ہوا جبکہ اجزا

شعور و حیات سے محروم ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ ارتقائی نظام اتفاقی طور پر وجود میں آیا۔ تو اتفاقی واقعات مسلسل اور منظم نہیں ہوتے کبھی شاذونادر وجود میں آتے ہیں۔ نہ یہ کہ وہ دائمی ضابطے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے اس کے سوائے چارہ نہیں کہ عالم کی جو شکل بھی ہے وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ کسی صاحب حکمت حاکم کے طے شدہ پروگرام کے تحت ایسا ہو رہا ہے اور وہی حاکم خدا ہے۔

۸۔ اشیاء عالم میں ایک حکیمانہ ترتیب موجود ہے، اجزاء حیوانات مرتب ہیں۔ نباتات کے اجزاء میں پرحکمت ترتیب موجود ہے۔ اسی طرح انسانی اعضاء میں مکمل ترتیب ہے اگر ان میں سے کسی چیز کی ترتیب بگڑ جائے۔ تو اس چیز کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ عناصر کائنات جو سیارات کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔ اگر اسکی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو اس حالت کے دن رات موجودہ دن رات سے دس گنا بڑے ہوتے جس کے نتیجہ میں دن کے طویل ہونے کی وجہ سے فصلیں گرمی کی وجہ سے برباد ہو جائیں اور جو فصلیں بچ جائیں وہ رات کی سردی سے ختم ہو جاتیں۔ اسی طرح سورج کا فاصلہ ہم سے ۹ کروڑ چالیس لاکھ میل ہے۔ اگر سورج اس سے دگنے فاصلے پر ہوتا تو سب انسان حیوان نبات جم کر برف بن جاتے اور اگر سورج آدھے فاصلے کے اندازہ پر ہمارے قریب ہوتا، تو تمام حیوانات نباتات جمادات گرمی سے جل کر خاکستر بن جاتے۔ اب یہ حکیمانہ ترتیب کہاں سے آئی۔ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ یہ ایک حکیم ذات کی کار فرمائی کا نتیجہ ہے۔ جو خدا ہے۔ نہ مادی اجزاء کی اندھی حرکت کا جدید فلاسفہ کا اتفاق ہے کہ اگر کاغذ کی پرچیوں پر بالترتیب ایک سے دس تک کے ہندسے لکھے جائیں۔ اور تھیلے میں غلط ملط کر کے ایک اندھے آدمی سے کہا جائے کہ تھیلے سے ایک ایک پرچی نکالتے جاؤ۔ تو کروڑوں سال نکالنے پر بھی ترتیب وار ایک سے دس تک کے ہندسے نکل جانے کی نوبت نہ آئے گی۔ تو کارخانۂ عالم کی یہ عظیم ترتیب اتفاقی رنگ میں اندھے اور بے شعور مادے سے کیونکر وجود میں آسکتی ہے اسی کو قرآن حکیم نے بلیغ انداز میں یوں بیان کیا ہے ولہ اسلم من فی السمٰوات والارض۔ خالق کائنات کے قانون کے آگے گردن نہادہ ہیں۔ آسمان اور زمین کے کائنات صنع اللہ الذی اتقن کل شیئی۔ یہ نقشۂ عالم کاریگری ہے اس ذات کی جسنے محکم ترتیب میں اس کو جکڑ دیا ہے۔

۹۔ اجزاء مادہ کی حرکت سے اگر کائنات خود بخود وجود میں آئی تو کائنات کے مختلف شعبوں

میں جو مقصودیت اور یگانگت پائی جاتی ہے، وہ کہاں سے آئی جبکہ مادہ ان اوصاف سے خالی ہے۔ کہ وہ کائنات کے کسی شعبے کے لئے کوئی حکیمانہ نظام تجویز کرے۔ اور پھر اس نظام پر کنٹرول کر سکے اور ان نظاموں کو ایسی حالت میں رکھے کہ ایک نظام دوسرے سے متصادم نہ ہو ان امور کے لئے ایک خارجی قوت کی ضرورت ہے۔ دنیا کی چھوٹی مشین خود بخود نہیں چل سکتی اس کے لئے قابل انجنیئر اور کارندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو دنیا کی عظیم الشان مشین خود بخود کیسے چل سکتی ہے۔ اس لئے خارجی قوت یعنی ذات رب العالمین کا وجود ضروری ہے۔ جو اس عظیم مشین کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے جوڑ دیں اور خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کو چلائے۔ اور اس پر کنٹرول رکھیں تاکہ نظام کائنات درہم برہم نہ ہو۔

۱۔ انکار خدا کی سب سے بڑی وجہ ازلیت مادہ کا تصور ہے۔ حالانکہ مادہ حادث ہے۔ ازلیت کے تصور کو اس غلط فہمی نے پیدا کیا کہ اگر مادہ نہ ہو تو صرف نیستی سے ہستی وجود میں نہیں آسکتی حالانکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے۔ اسلام کا یہ تصور کہ صرف مادہ آغاز تخلیق میں نیست سے ہست ہوا۔ بعد ازاں تمام اجسام عالم اجزاء مادہ کی ترکیب سے پیدا ہوئے ہیں اور آغاز تخلیق کے ایک واقعہ کے بغیر باقی کل تخلیقی واقعات اور تخلیقی سلسلے ہست سے ہست ہوئے ہیں، یعنی اجزاء مادہ کی ترکیب سے اجسام مادہ وجود میں آئے ہیں۔ اس لئے ہر دور کے مشاہدہ میں جو تخلیقی صورتیں ہیں۔ وہ ہست سے ہست کی ہیں۔ نیست سے ہست ہونے کا واقعہ صرف ایک ہے اور وہ مشاہدات کی سرحدوں سے پہلے ایک بار وقوع میں آیا ہے کہ جس وقت نہ کوئی جسم تھا نہ انسان نہ سائنس دان۔ اب اگر کوئی نادان کہے کہ نیست سے ہست کا مشاہدہ کراؤ تب میں مانوں گا۔ تو اس کا صاف جواب یہ ہے۔ کہ تم ہم کو اس زمانہ میں لے جاؤ جس میں اجزاء مادہ کو نیست سے ہست کر دیا گیا تھا۔ تو ہم مشاہدہ بھی کرائیں گے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو مشاہدہ کا یہ مطالبہ ایسا ہے کہ اس وقت کوئی کہہ دے کہ ہمیں اس وقت دارا اور سکندر کی جنگ کا مشاہدہ کراؤ۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ جنگ سابق زمانہ سے متعلق ہے نہ اس زمانہ سے۔ ۲۔ مادہ اس لحاظ سے بھی حادث ہے کہ مادی اجزاء یعنی برقی پارے دو حالتوں سے خالی نہیں یا متحرک ہوں گے یا ساکن کیونکہ اگر برقی پارے دو وقتوں میں دو جگہوں میں ہوں گے تو متحرک، اگر دو وقت میں ایک جگہ ہی رہیں گے تو ساکن جب حرکت یا سکون میں سے کوئی ایک اجزاء مادہ کے ساتھ لازم ہے اور حرکت و سکون حادث اور نو پیدا ہیں۔ کیونکہ حرکت سکون سے فنا ہوتی ہے اور سکون حرکت

سے زائل ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مادہ بھی اپنے لوازمات یعنی حرکت و سکون کی طرح حادث ہے، ازلی نہیں۔ جب مادہ حادث ہوا تو محدث نے اس کو پیدا کیا ہوگا۔ وہ محدث اگر حادث ہوگا تو تسلسل لازم آئے گا۔ اگر قدیم ہوگا تو اس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ ۳۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ اب باطل ہو چکا ہے کہ مادہ ازلی ہے، گم اور معدوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب افکار حاضرہ مترجمہ محمد بن علی میں ہے کہ مادہ یعنی برق پاروں کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ ایک مقام پر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر خود وجود میں آجاتا ہے۔ یہ چھلانگ نہیں بلکہ اعدام ہے ایک مکان میں، اور ایجاد ہے دوسرے مکان پر اس میں عدم مادہ کا صاف اقرار موجود ہے اور ثانوی وجود بغیر کسی مادہ کے ہوا ہے جس سے نیست سے ہست ہونا ثابت ہوا۔

۱۱۔ ——— انسانی مصنوعات میں سب وہ ہیں جو ہست سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی کسی مادہ سے ترکیب پا چکے ہیں۔ اور انہی مصنوعات میں بھی اکثریت ان مصنوعات کی ہے جو نیست سے نہیں بلکہ مادی اجزاء سے وجود میں آئے ہیں جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ نیست سے ہست کر دینا خارج از امکان ہے۔ حالانکہ یہ چند وجوہات سے غلط ہے۔ ۱۔ ایک تو اگر انسان نیست سے ہست نہیں کر سکتا تو یہ کیا ضروری ہے کہ خالق بھی نیست سے ہست نہ کر سکے۔ الٰہی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا غلط ہے کہ جو انسان سے نہ ہو سکے وہ خدا سے بھی نہ ہو سکے ہاتھی اور چیونٹی دونوں حیوان دونوں مخلوق ہیں لیکن ہاتھی بیس من بوجھ اٹھا سکتا ہے اور چیونٹی نہیں اٹھا سکتی۔ تو کیا چیونٹی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ جو کام میں نہیں کر سکتی ہاتھی بھی نہیں کر سکتا۔ ۲۔ اس کے علاوہ نیست سے ہست کی مثال بھی موجود ہے۔ ۱۔ لطیف اشیاء سب نیست سے ہست ہوتی ہیں۔ موم اگر کروی اور گول شکل میں ہو اور اس کو مبدل کر کے مربع شکل میں تبدیل کر دیں، تو موم تو جوں کی توں موجود ہے، لیکن کروی شکل معدوم ہوئی اور مربع شکل نیست سے ہست ہوئی، موم اس مربع شکل کا محل ہے، مادہ یا ملبہ نہیں۔ کیونکہ شکل ترکیبی اجزاء نہیں رکھتی۔ عشق و محبت بعض تصورات ذہنی سب نیست سے ہست ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کی تحلیل و تجزیہ کی کوشش کریں تو یہ ممکن نہیں کہ اس کے اجزاء ترکیبی نکل سکے، یہی حال مادہ کا ہے۔ کہ سائنس کے لحاظ سے برق پارے نہ نظر آتے ہیں، نہ ہم ان کو چھو سکتے ہیں بلکہ ان کا وجود ایک خیال تصور کے درجہ میں ہے۔ اس لئے ان کا وجود بلا کسی ہست کے مادہ کے عدم سے وجود میں آیا ہے۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب افکار حاضرہ اور سائنس کا ارتقا، محمد سعید میں مادہ کی یہ حقیقت مفصل

طور پر مذکور ہے۔

۱۲۔ بارھویں دلیل وجود خالق کی یہ ہے کہ مادہ حیات اور شعور سے خالی ہے۔ مادئین کے نزدیک حقائق کائنات صرف مادہ اور اسکی حرکت کا نام ہے، لیکن کائنات میں بالخصوص انسان میں حیات اور شعور نمایاں طور موجود ہے۔ یہ چیز ایسے مادہ سے کیونکر پیدا ہوئی۔ جو حیات اور شعور دونوں سے خالی ہے یہ وہ عقیدہ ہے کہ بیسویں صدی تک سائنس دان اس کے حل کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی کا مشہور محقق ورشو جو دہریت کا پُرزور مبلغ تھا اس نے ۲۱ سال بعد دہریت سے توبہ کر لی ورشو کی طرح ریمونڈ جو علم الحیاتیات کا ماہر اور برلن اکیڈمی کا گراں پایہ کلیم تھا۔ اس نے اپنے ایک مقالہ علم طبیعات کے حدود میں صاف کہہ دیا کہ سات مسائل کے حل کرنے سے سائنس عاجز ہے۔

۱۔ مادہ اور قوت کی اصلیت ۔ ۲۔ حرکت کا مبداء ۳۔ اور اس کے مبداء کا آغاز ۔ ۴۔ علم حیات کا مبداء ۵۔ کائنات کا باقاعدہ نظام ۔ ۶۔ قوت ناطقہ کا آغاز ۔ ۷۔ مسئلہ جبر و اختیار ۔ معارج الدین صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸

یہی سائنس کے حدود ہیں جہاں سائنس پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اور اقرار عجز کرتی ہے۔ لیکن سائنس کی جہاں انتہاء ہے وہ مذہب کی ابتداء ہے۔ ان سات سوالات کو مذہب نے حل کر دیا ہے کہ صرف خدائے حکیم کے وجود کا اعتراف کرنے سے ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ برق پاروں کے مادی تصوّر کے تحت ان مسائل کے حل کر دینے کا امکان ہی نہیں۔

ایک خدا ترس اور علم دوست بزرگ کی وفات

تعزیت | ۲ مارچ بروز پیر پشاور شہر کے ممتاز علم دوست مخیر شخصیت جناب الحاج میاں کرم الٰہی صاحب تاجر جلائے چوک یادگار پشاور وفات پاگئے، عمر ستر برس کے قریب تھی عرصہ سے شوگر وغیرہ کے امراض کا شکار تھے، وفات سے چند دن قبل دل کے دورے پڑنے لگے جو جان لیوا ثابت ہوئے، دارالعلوم حقانیہ کے قیام سے لیکر اب تک اسکی ترقی واستحکام میں بھرپور حصہ لیا اور مالی وجانی مدد کرتے رہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ اور دیگر اکابر علم وفضل سے نہایت گرویدگی تھی۔ عمر بھر رفاہ عامہ اور فقراء واہل علم کی مدد میں کوشاں رہے ہے پشاور کے ایک ممتاز قدیمی خاندان کے بزرگوں میں سے تھے، نماز جنازہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے پڑھایا اور قبیل مغرب مشہور ولی اللہ شیخ جنید بابا رح کے جوار میں سپرد خاک کئے گئے۔ موصوف دارالعلوم کے دیرینہ مخلص خادم ہونے کے علاوہ ہمارے محترم مولانا سمیع الحق صاحب ایڈیٹر الحق کے خسر تھے۔ اس مناسبت سے دارالعلوم کے تمام فضلاء اور متعلقین سے بھی مرحوم کیلئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی اپیل ہے۔ دارالعلوم حقانیہ اور ادارۂ الحق مرحوم کے تمام لواحقین کے ساتھ شریک تعزیت ہے۔ (شیر علی شاہ مدرس دارالعلوم)

سفینۂ عرفات کے مسافر

جو عرفات سے روک دیے گئے

تیرہ سو پاکستانی حجاج کا خود ساختہ قرنطینہ کی پابندیوں کی وجہ سے سعادت حج سے محروم ہو جانا اس عہد کا ایک افسوسناک المیہ ہے۔ ان مظلوم اور بے کس زائرین بیت اللہ کے قافلہ سے ہمارے ایک محترم دوست (مولانا محمد ہارون ڈھاکہ) اور دوسرے چند سرکردہ حضرات کی لکھی ہوئی ایک رپورٹ ہمیں پہنچی ہے۔ اگر یہ حقائق صحیح ہیں تو نہ صرف یہ کہ پاکستانی سفارتخانہ کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے، بلکہ اس سے سعودی حکومت کی بے حسی اور یورپی تہذیب میں اس کے سراپا استغراق اور اس کے نتیجہ میں مسبب حقیقی خداوند عالم پر بھروسہ کے فقدان کی بھی پوری عکاسی ہو رہی ہے۔ (ادارہ)

جدہ قرنطینہ کیمپ

۲۲ر فروری ۱۹۷۰ء

ہم پاکستان کے وہ پندرہ سو بدقسمت عازمین حج ہیں جو ۲۴ر جنوری ۱۹۷۰ء کو بذریعہ ایم ڈی سفینۂ عرفات چاٹگام سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل ہم سب کو ٹیکے لگائے گئے اور ہر شخص کو ہیلتھ سرٹیفکیٹ بھی مہیا کیا گیا۔ ۲۳ر جنوری کو جب ہم جہاز پر سوار ہوئے تو ڈاکٹروں نے ہمارے کاغذات کی مکمل جانچ پڑتال کی۔ سفینۂ عرفات کو کراچی کے راستے سفر کرنا تھا۔ جہاز کولمبو پہنچا تو یہ خبر بڑی بے چینی کے ساتھ سنی گئی کہ دو مسافروں کو چیچک نکل آئی ہے۔ کپتان صاحب کو عام مسافروں نے مشورہ دیا کہ متاثرہ افراد کو کراچی اتار دیا جائے، تاکہ جدہ پہنچ کر تمام حاجیوں کے لئے مصیبت کا باعث نہ بن جائیں۔ مگر اس مشورے پر کان دھرنے کی بجائے کراچی سے دو سو کے قریب درجہ اوّل اور عرشے کے مسافروں کو سوار کیا گیا زندگی کے مقدس ترین سفر کے احساس نے ہمیں مہلت ہی نہ دی کہ مزید تحقیق و تفتیش کر سکتے جہاز کراچی

سے روانہ ہوا اور تکبیر و تہلیل کی صداؤں میں ۹ر فروری کو جدہ پہنچ گیا۔
قانون کے مطابق سعودی عرب کے سرکاری ڈاکٹر جہاز پر آئے اور دونوں مریضوں کو خطرناک قرار دیا گیا۔ جہاز کو گودی کے ساتھ لگنے کی اجازت نہ ملی۔ تمام مسافروں کو دوبارہ چیچک کے ٹیکے لگائے گئے اور جہاز ساحل سے دور سمندر ہی میں کھڑا رہا۔
۱۰ر فروری کی صبح جہاز کے کپتان نے سعودی عرب میں پاکستانی سفارت خانے کا ایک انگریزی خط پڑھ کر سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ شاہ فیصل نے پاکستان سے خصوصی تعلقات کی بناء پر ہمیں ۱۵ر فروری کو قرنطینہ کی شیشہ بند بسوں میں پولیس کی نگرانی میں موقوف عرفات کی اجازت دے دی ہے۔ اس کے بعد سات روز تک ہمیں قرنطینہ کیمپ میں رہنا ہوگا اور بعد میں حج کی ادائیگی اور مدینہ منورہ جانے کی کھلی اجازت ہوگی۔ خط میں تنبیہ کی گئی تھی کہ متعلقہ ضوابط اور قوانین کی پوری پابندی کی جائے۔ ہنگامہ آرائی سے احتراز کیا جائے اور کھانے پینے کا انتظام بسوں کے اندر ہونا چاہیئے۔
۱۳ر فروری کو معلوم ہوا کہ جہاز کے کپتان نے مذکورہ شرائط منظور کرنے کی اطلاع بھجوائی ہے۔ امید بندھ گئی کہ فریضۂ حج کی ادائیگی ہو جائے گی۔
۱۴ر فروری کو جہاز ران کمپنی کے ایجنٹ کا خط پڑھ کر سنایا گیا اس کا مضمون بھی سفارت خانے والے خط سے ملتا جلتا تھا، البتہ یہ اضافہ تھا کہ جہاز کے عملے کو ساحل پر اترنے کی اجازت نہیں ہوگی۔
اسی روز عصر کے قریب اچانک اعلان ہوا کہ جہاز گودی میں لگ رہا ہے اور مسافروں کو آج ہی اتارنے کی کوشش کی جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز گودی میں داخل ہو چکا ہے، مسافر اپنا اپنا سامان باندھ لیں اور اترنے کی تیاریاں کریں۔ مگر اپنے ساتھ صرف اتنا سامان لیں جو چوبیس گھنٹے کے لئے کافی ہو۔ باقی اشیاء بعد میں ٹرکوں کے ذریعے ان تک پہنچ جائیں گی ـــــ اس موقع پر مسافروں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ مایوسی کی فضا چھٹ گئی اور امید کا آفتاب پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگا ـــــ
جس وقت ہم جہاز سے اتر رہے تھے، کپتان نے بڑے دردناک لہجے میں الوداعی خطبہ دیا، ہمیں وقوف عرفات کی روانگی پر مبارکباد دی اور جہاز کے عملے کے لئے دعا کی درخواست کی۔
مسافروں کو عین مغرب کے وقت جہاز سے اتارا گیا۔ ہزار منت سماجت کے باوجود نماز کی مہلت نہ دی گئی۔ ہم پولیس کے سخت پہرے میں بند بسوں میں سوار ہوئے اور جدہ کیمپ میں پہنچا دئے گئے اس وقت پاکستان کے عازمین حج کی حالت خطرناک مجرموں سے بھی بدتر تھی۔
رات کو یہ خبر گشت کرنے لگی کہ ہمیں وقوف عرفات کی اجازت نہیں ملے گی۔ سنجیدہ افراد

نے اس خبر کا کوئی نوٹس نہ لیا اور اسے افواہ قرار دے کر عام لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، ان کا کہنا تھا، پاکستانی سفارت خانے کی واضح یقین دہانی اور جہاز ران کمپنی کے ایجنٹ کی غیر مبہم ہدایات کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن ساری خوش گمانیاں ہوا ہوگئیں۔ ہم ساری دنیا سے کٹ گئے، کوئی ہمارا پرسانِ حال نہ رہا، چنانچہ ۱۴ر کی رات سے تادم تحریر پاکستانی سفارت خانے سے ان گنت مرتبہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، بار بار فون کئے۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے، سفارت خانے میں کوئی شخص موجود ہی نہیں۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف ۱۱ر فروری کو قدوائی نام کے ایک پاکستانی افسر جہاز ران کمپنی کے ایجنٹ کے ساتھ جہاز پر تشریف لائے، مگر جب زائرین نے اپنی مصیبتوں کی کتھا سنائی، تو انہیں سخت سست کہہ کر چلتے بنے۔ ۱۹ر فروری کو یہ کہہ کر ہمارا منہ بند کر دیا گیا کہ ۲۱ فروری تک سعودی حکومت کے دفاتر بند ہیں، اس لئے متعلقہ افراد سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا پاکستانی سفارت خانے نے ہماری کوئی خبر نہ لی۔

جب یقین ہو گیا کہ ۹ر ذی الحجہ کو ہم عرفات نہیں پہنچ سکتے، تو ہم نے قرنطینہ کے مدیر کی منت سماجت کی کہ ہمیں کم از کم ۱۰ر ذی الحجہ کی رات کو ہی (جب میدانِ عرفات خالی ہو چکا ہوگا) بند لبسوں میں وقوفِ عرفات کرایا جائے، لیکن ہماری ایک نہ سنی گئی۔ حج اور عید کے ایّام ہمارے لئے قیامت سے کم نہیں تھے۔ لاکھوں فرزندانِ توحید حج کی سعادت سے مشرف ہو رہے تھے اور ہم لوگ جنہوں نے دوسرے پاکستانیوں کی طرح لاتعداد دشواریاں محض بیت اللہ کی زیارت کی خاطر سہی تھیں، نام نہاد قرنطینہ کیمپ میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں پڑے تھے۔ چاروں طرف پولیس کا سخت پہرہ تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کا ظالمانہ سلوک، زبان کی اجنبیت اور کعبۃ اللہ کے قریب ہوتے ہوئے بھی حج کی سعادت سے محرومی ——— جو کیفیت ہمارے دل و دماغ پر گزری اُسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

۷ر فروری سے آج ۲۲ر فروری تک یعنی دو ہفتے گزر رہے ہیں اور ہم ابھی تک احرام کی حالت میں ہیں۔ ہم نے زبانی اور تحریری طور پر متعلقہ حکام سے بارہا درخواستیں کی ہیں کہ ہمیں عمرہ کرنے کی اجازت دی جائے، تاکہ ہم احرام کی پابندیوں سے نجات پا سکیں، لیکن ہماری ہر فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوئی ہے۔ اتنے دن تک نہائے دھوئے، حجامت بنوائے اور کپڑے تبدیل کئے بغیر رہنا جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کیمپ کا انتظام بے حد ناقص اور صحت کیلئے انتہائی ناساز گار ہے۔ حیرت کی بات ہے ہمیں محض حفظانِ صحت کے لئے اتنی کڑی سزا دی جا رہی ہے

لیکن ہماری صحت کا کوئی خیال نہیں کیا جارہا۔ نہ صفائی کا کوئی انتظام ہے نہ اچھے کھانے کا، نہ ضرورت کے مطابق پانی کا ---- ہم ایسی جگہ میں قید ہیں جہاں ہر طرف غلاظت کے ڈھیر ہیں اور تعفّن سے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ نتیجۃً بیشتر لوگ مختلف امراض کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ علاج کا کوئی معقول بندوبست نہیں، نہ رات کی سردی اور دن کی گرمی سے بچاؤ کا کوئی انتظام ہے۔ مکھیوں اور مچھروں کی یلغار ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ ہمارا سارا سامان اب تک کھلے میدان میں سڑ رہا ہے اور کسی کو وہاں تک جانے کی اجازت نہیں ----

کیمپ میں ایک چھوٹی سی کینٹین ہے جہاں سے ضرورت کی بہت کم اشیاء دستیاب ہوتی ہیں اور وہ بھی منہ مانگے داموں پر ---- باہر سے منگوانے کا کوئی سوال نہیں۔ ہم پوری دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔ قرنطینہ کے بعض پاکستانی اہلکار ایک ایک پوسٹل لفافے کے تین تین پاکستانی روپے وصول کر رہے ہیں۔ کہا گیا تھا کہ ہمیں کیمپ میں سات روز تک رہنا ہوگا، لیکن دو ہفتے بیت گئے ہیں اور خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ اب کہا جارہا ہے کہ اگر مریضوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو مدت قیام میں توسیع کردی جائے گی ---- ہم چار ہزار میل سے آپ سے مخاطب ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ براہ کرم حکومت پاکستان اور شاہ فیصل کو ہماری حالتِ زار سے آگاہ کیجئے تاکہ ہم اس عقوبت خانے سے رہائی پاسکیں۔ پندرہ سو افراد کو دو چار بیمار آدمیوں کے جرم بے گناہی کی سزا دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ :

۱۔ ہم پندرہ سو افراد کو قرنطینہ کی پابندیوں سے جلد از جلد رہا کیا جائے۔ عمرہ اور زیارت کی اجازت دی جائے ---- ۲۔ آئندہ برس ہم لوگوں کو سعودی یا پاکستانی مصارف پر حج کرایا جائے، کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ حج ہم پر فرض ہوچکا ہے ---- ۳۔ آئندہ حاجیوں کو لانے والا آخری جہاز حج سے کم از کم سولہ روز پہلے جدہ پہنچ جانا چاہئے تاکہ قرنطینہ کی صورت میں یہ لوگ حج کی ادائیگی سے محروم نہ رہیں ----

۴۔ اس طرح کے نازک شرعی معاملے میں مستند علماء سے رائے لی جائے اور مادہ پرست ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل نہ کیا جائے۔

امید ہے ہم لوگوں کی مظلومیت آئندہ اس طرح کے حالات پیدا نہیں ہونے دے گی والسلام

میجر محمد دلاب حسین۔ چیئرمین عازمین حج و چیئرمین اصلاحی کمیٹی سفینۂ عرفات۔

محمد رضوان، ڈھاکہ۔ امیر تبلیغی جماعت ڈھاکہ۔

شیخ عبدالغنی، رحیم یار خان۔ جائنٹ سیکرٹری اصلاحی کمیٹی سفینۂ عرفات

محمد ہارون ناظم ادارۃ المعارف ڈھاکہ نمبر ۲

قاضی عبدالحکیم امیر الحجاج سفینۂ عرفات۔

اسلام کی پوری عمارت
عقیدۂ ختم نبوّت پر قائم ہے

دارالعلوم حقانیہ کے دستار بندی جلسے اپنی خصوصیات اور امتیازی شان کی وجہ سے ملک وملت کے حق میں مفید اور دور رس نتائج کے حامل رہے ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے اکابر علم وفضل اور اعیان ملک کی شرکت اور سامعین کی شمولیت کے لحاظ سے ان جلسوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل ۱۶-۱۷ مئی ۱۹۵۱ء کو ایسا ہی ایک جلسہ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے منعقد ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح حضرت شاہ جی مرحوم بھی اس میں شریک تھے اور مخصوص انداز میں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت اور اساسی حیثیت پر روشنی ڈالی اس تقریر کی رپورٹنگ اس وقت پشاور کے ایک ہفت روزہ البلاغ نے کی اور اسے ۸ رجون ۱۹۵۱ء کے خصوصی شمارہ میں شائع کیا تھا ہم اسے افادۂ عام اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو تذکرہ کے ساتھ ساتھ تبرک بھی ہے۔ (ادارہ)

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کے سالانہ اجتماع کی دوسری نشست میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے مولانا سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریر شروع ہوئی۔ حاضرین اس قدر تھے کہ پنڈال کی قناتیں کھول دی گئی تھیں اور دور تک انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت کی حاضری کم ازکم پندرہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی تقریر اس وقت شروع کی جب اتفاقی طور پر لاؤڈ سپیکر فیل ہو گیا تھا[1]۔ جو بعد میں ٹھیک ہو گیا۔ شاہ صاحب نے حمد وثنا کے بعد تقریر شروع کرتے ہوئے فرمایا:

بزرگوں نے میرا امتحان لینا چاہا ہے کہ میں بے لاؤڈ سپیکر بھی بول سکتا ہوں۔ اگرچہ اب بخاری نہ

---

[1] شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی تقریر کے دوران بجلی کٹ گئی۔ (ادارہ)

بخاری نہیں رہا جو اس مجمع سے زیادہ مجموں کو بھی بغیر لاؤڈ سپیکر کے خطاب کرتا رہا ہے۔ تاہم میں کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے ہمت دے۔ اور آپ بھی دل میں اسکی دعا کرتے رہیں۔

اس کے بعد آپ نے باقاعدہ تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ اپنی سمجھ میں اتنی بات آچکی ہے کہ مذہب میں - اپنے مذہب میں! مجھے دوسرے مذہب سے تعلق نہیں، نہ میں اس کی کتابیں پڑھتا ہوں، نہ ہی اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ بلکہ اتنا ہی جانتا ہوں کہ مذہب اپنا ہے۔ اسے ہی سمجھو سمجھاؤ ـــ ہاں تو اپنی سمجھ میں اتنی بات آچکی ہے کہ اپنے مذہب میں تین ہی چیزیں ہیں۔ ایک عقیدہ، پھر عبادت اور معاملات، بس یہ تین چیزیں ہیں۔ میں اس وقت نہ عبادات کے متعلق کچھ کہوں گا، نہ معاملے کے متعلق کیونکہ یہ بات اپنی سمجھ میں آگئی ہے کہ بغیر عقیدے کے کوئی عمل ہوتا نہیں۔ اور عقیدہ ـــ؟ اس کے معنے ہیں اردو میں دل کی بات۔ اور دل کی بات جب دل میں پکی ہو جائے، تب ہی "عقیدۃ" کوئی عمل عمل بن سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے کہا کہ علامہ انور شاہ صاحب کی بات یاد آگئی کہ کوڑھی کو جتنی اچھی غذا آپ کھلائیں گے۔ اس کا مرض بڑھے گا۔ اور اطباء اس پر متفق ہیں کہ اس کا بدن گلتا ہی جائے گا، سڑتا ہی جائے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ جس کا عقیدہ بگڑ گیا، اسکی روح کو کوڑھ ہو گیا۔ جتنی عبادت کرے گا۔ اتنا ہی عذاب پائے گا۔ یہ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا میں اسکی مثال دیتا ہوں، بتائیے اس شامیانے کی، اس شامیانے کی جو اس وقت آپ کے سروں پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ تو یہ اسی طرح سایہ فگن رہے گا۔؟ کہ زمین پر آرہے گا۔ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے کہا وہ سامنے بلند و بالا عمارت ہے، اسکی بنیاد کھوکھلی ہو تو ہر وقت گرنے کا کھٹکا۔ لیکن اگر عمارت معمولی ہے۔ مگر بنیاد مضبوط ہے تو چین سے بسر ہو جائے گی۔ بس عقیدہ درست ہو، کثرت عبادات نہ ہو۔ صرف نمازیں ہی پڑھے۔ انشاء اللہ انجام بخیر ہو گیا۔ اور نوافل بھی ہوں، تہجد بھی ہو۔ اشراق بھی ہو، اوابین بھی ہو۔ ریاضت سب ہو! عقیدہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ـــ آریہ بھی عبادت کرتے ہیں، ہندو بھی ریاضت کرتا ہے۔ لیکن انہیں جہنمی اور کافر ہی کہا جاتا ہے۔ ہاں ہاں یہودی بھی تسبیح بہت کرتے ہیں۔ لیکن عقیدہ ہے۔ عزیر ابن اللہ کا جو لے ڈوبا، بالکل لے ڈوبا۔

اب شاہ صاحب کا انداز بیان گرجدار تھا۔ آپ نے کہا لعنت ہو فرنگی پر! اس نے دو سو سال کی منحوس حکومت میں چوٹ لگائی ہمارے بنیادی عقیدے پر، جو جان ہے سب اسلام کی! ـــ توحید کی جڑ ہے۔ اور وہ عقیدہ ہے ختم نبوت کا، اسلام کا صحیح تصور نبی کے سوا کوئی

پیش نہیں کر سکتا۔ خدا کو تو سب ہی مانتے ہیں اور مانتے تھے۔ خدا کو تو سب ہی پکارتے ہیں۔ خدا کا انکار تو کوئی پرلے درجے کا بیوقوف ہی کرے گا۔ جو اپنے وجود کا تو قائل ہو اور خدا کے وجود کا انکار کرے۔ خدا کو ہر ایک مانتا ہے، چاہے وہ اپنا ہی بنایا ہوا تھا۔ جیسے صبح کو گھڑا، اور شام کو اس کا خدا ہو گیا ـــــ منکر خدا تو یہ بھی نہ تھے۔ سب خدا کے وجود کے قائل تھے۔ میں کہہ رہا تھا کہ منکر خدا تو ہوئے نہیں البتہ خدا کا صحیح تصوّر ملتا نہیں ـــــ اگر ملتا ہے تو نبی سے۔ جیسے خود خدا نے بنایا۔ وہ خدا تو مر گیا، ٹوٹ گیا، پھوٹ گیا۔ ایک ضرب زیادہ پڑنے سے نکٹا ہو گیا۔ ننجا ہو گیا۔ لیکن نبی جو خدا دیتا ہے جس خدا کا تصوّر نبی سے ملتا ہے، وہ مرتا نہیں، ٹوٹتا نہیں۔ بے عیب ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے بیان کا مرکز متعین کرتے ہوئے کہا۔ شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہ العزیز نے چالیس سال میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں اللّٰہ الصمد کا ترجمہ شاہ صاحب نے " اللہ نرادھار " ہے کیا ہے۔ نرادھار، نرادھار! (یعنی) جس بن کسی کا کام نہ چلے اور جس کا کام کسی بن نہ اڑے۔ خدا کا یہ تصوّر نبوت ہی پیش کر سکتی ہے۔ اور کوئی نہیں اور اسکی جڑ زنگی نے کاٹی ـــــ!

شاہ صاحب نے گرجدار آواز میں کہا۔ کیسے پنجاب سے ایک نبی اٹھا۔؟ اٹھا نہیں! اٹھایا گیا۔ ذرا نرم آواز میں شاہ صاحب نے کہا میں نے تو یہ اندازہ لگایا ہے کہ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، وہ پاگل ہے یا پاجی اور ایسے پاجیوں کا سلسلہ مسیلمہ کذّاب سے پنجابی نبی تک آیا ہے۔ نبوت ایک مرکز ہے، جیسے قومیں فنا کرنے اٹھیں! لیکن اس کا علاج بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔

آگے چل کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا: تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ مدعیٔ نبوت کے نقائص کی بنا پر اس کے دعوے کی تردید کی جائے کہ وہ شراب پیتا تھا۔ لہذا نبی نہیں۔ اسکی مخبوط الحواسی کی بہت سی دلیلیں ہیں۔ لہذا نبی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک رخ اور بھی ہے، وہ یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان کرایا گیا۔ قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً۔ فرما دیجئے اے پیغمبر! اے لوگو! بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ نبی ہوں۔ پیغامبر ہوں۔ ظلّی بروزی کا جھگڑا ہی نہیں! تم سب کی طرف! ساری خدائی کی طرف۔ خدا کی ساری بادشاہی کے لئے ایک رسول! آخری رسول! خطاب کیا گیا ہے۔ "اے لوگو! یا ایھا الناس" تو جس نے اس نبوت سے کنّی کاٹی۔ وہ لوگوں میں کہاں رہا۔؟ اس کا شمار انسانوں میں کب ہو گا۔ یہ ہے تصویر کا دوسرا رخ جس سے جھوٹی نبوت کا جھوٹ کھلتا ہے، اور جھوٹے نبیوں کے چہرے کی بدرونقی اس آئینہ میں نظر آتی ہے ـــــ اس کے بعد شاہ صاحب

باقی صفحہ ۴۳ پر

بروایت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتب : محمد اقبال قریشی ہارون آبادی

علوم و معارف ــــ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی

★

ــــ فرمایا : عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد　　　آنکہ ناپیداست ہرگز کم مباد

یعنی ان کا حملہ نظر آتا ہے اور ہوا حملہ کرنے والی نظر نہیں آتی۔ آگے بطور دعا کے فرماتے ہیں ، جو چیز نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو۔ دوسرے مصرعہ کی تفسیر حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے فرمائی ہے ، از دل ما یعنی ہمارے دل سے اس کا تصور ہرگز کم نہ ہو ورنہ اسکی ذات کے کم نہ ہونے کی دعا کے کوئی معنی نہیں ؎

أَنْتَ كَالرِّيحِ نَحْنُ كَالْغُبَارِ　　　يَخْتَفِي الرِّيحُ وَغُبَرَا الْاَجْهَارُ

تو مثل ہوا کے ہے اور ہم مثل غبار کے۔ ہوا پوشیدہ ہے اور اس کا غبار ظاہر ہے۔ (العبادہ ص۱۶)

ــــ فرمایا : ایک اور مثال حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک طوطا پنجرے میں بند ہے۔ اور باغ کے ایک درخت میں بندھا ہوا ہے۔ درخت پر دوسرے طوطے دوڑ رہے ہیں۔ اور خوش ہو رہے ہیں۔ یہ طوطا جو پنجرے میں بند ہے ، چاہے گا کہ یہ قفس ٹوٹ جائے اور میں ان طوطوں میں مل جاؤں اور ایک اور طوطا پنجرے میں بند ہے اور اس کے گرداگرد بلیوں کا ہجوم ہے۔ وہ اس قید ہی کو غنیمت سمجھے گا۔ اسی طرح انسان کا بدن گویا ایک قفس ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی ہر شخص تمنا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ نیک ہیں وہ البتہ خواہش ظاہر کریں گے کہ جلد قفس عنصری ٹوٹ جائے ، اور روح نکل کر واصل بحق ہو۔ ایسے تمنا نہیں کر سکتے۔ بلکہ موت سے گھبرائیں گے اور ڈریں گے۔ یہی مطلب ہے۔ اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ۔ یعنی دنیا مومن کیلئے بمنزلہ جیل کے ہے۔ اور کافر کیلئے جنت ہے۔ وہ طوطا جس پر بلیوں کا ہجوم ہے قفس کو جنت خیال کرتا ہے اور جو باغ میں لٹکا ہوا ہے وہ قفس کو جیل خانہ سمجھتا ہے اور وطن اصلی کو یاد کر کے اسکی آرزو کرتا ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگار وصل خویش

ہر شخص کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اصلیت سے دور ہو جاتا ہے تو پھر اپنے گزرتے ہوئے زمانہ کو یاد کرتا ہے۔ (شوق اللقاء صہ ۳۴)

● فرمایا: مخلوق تو ہزاروں ہیں اور ہر ایک کی خواہش دوسروں کے معارض تو پھر کس کس کو راضی کیجئے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک شخص تھا، اس کے پاس ایک ٹٹو تھا۔ اور بیوی بچہ اور کنبہ رکھتا تھا۔ اس کو سفر درپیش تھا، اس نے تجویز کی کہ ایک جانور ہے اور کئی سوار ہیں۔ باری باری سب مل کے چڑھتے اترتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے وہ خود سوار ہوا اور اپنے سیانے لڑکے اور بیوی کو پیادہ لے کر چلا۔ چلتے چلتے ایک گاؤں میں گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے اسے سوار دیکھ کر کہا کہ بچہ پیادہ اور عورت جو قابل رحم ہے وہ پیادہ۔ اور خود ہٹا کٹا ہو کر سوار ہے۔ اس نے کہا بات تو ٹھیک ہے۔ بس خود اتر پڑا۔ اور بیوی کو سوار کر دیا۔ دوسرے گاؤں میں پہنچا، گاؤں والوں نے دیکھ کر کہنا شروع کیا کہ بیوی کا غلام ہے کہ سائیس کیطرح گھوڑے کی رسّی پکڑے چلا جا رہا ہے۔ ارے کم بخت تجھ پر کیا مار آئی۔ تو نے اپنا وقار کیوں کھویا۔ اس نے کہا یہ بھی سچ ہے۔ آؤ اب سب مل کر سوار ہوں۔ تیسرے گاؤں میں پہنچا، وہاں لوگوں نے کہا کہ ارے کیسا ظالم ہے۔ اسے ایک دفعہ گولی مار دے، ترسا ترسا کر مارنے سے کیا فائدہ۔ اس نے کہا یہ بھی معقول ہے۔ چنانچہ اب سب پیادہ پا چلے اور سواری خالی ساتھ رکھی۔ پانچویں گاؤں سے گزر ہوا۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی اور کہا دیکھی ناشکری خدا کی۔ خدا تعالیٰ نے سواری بھی دی اور اسکی قدر نہیں۔ ارے ایک سواری تھی تو سب مل کے باری باری چڑھتے اترتے چلے جاتے۔ اس نے کہا اب کسی طرح الزام سے نہیں بچ سکتے۔ اب وہی کرو جو جی میں آئے اور کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کرو۔ بس وہ اترتے چڑھتے چلے گئے۔ خدا تعالیٰ نے اسے اس تجربہ سے عقل دی کہ وہی کرو جس میں راحت ہو اور کسی کے طعن و تشنیع کی پرواہ نہ کرو۔

بزرگوں پر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرتے۔ چنانچہ حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

خلق مے گوید کہ خسرو بت پرستی مے کند
آرے آرے مے کند با خلق عالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں خسرو بت پرستی کرتا ہے۔ چلو ہاں ہاں کرتا ہے، لوگوں سے کوئی کام نہیں ہے۔ (الشریعت صہ ۲) ——— سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس واقعہ کو غذائے روح

میں دلنشین نظم میں تحریر فرمایا ہے۔ آخری ناصحانہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎　　(مجموعہ کلیات امدادیہ ص۱۷۱)

لغو سے بچتی ہے کب خلق خدا　　آپ کو امدادؒ تو ان سے بچا
خلق کو اچھے بُرے کہنے سے تو　　رنج و غم میں ڈال مت بس آپکو
کہنے سننے پر نہ کر ان کے خیال　　کام کر راضی ہو جس سے ذوالجلال
نیک اور بد پر نہ کر انکے نظر　　کام کا جو کام ہے وہ کام کر
ساقیا آ کھو غم دنیا و دیں　　اس سے تا میں ہوں فارغ کہیں
ہو نہ دنیا میں خیالِ اکتساب　　اور نہ عقبیٰ میں غم اجر و ثواب
شغل ہو ہر دم خیال یار سے　　بے خبر ہوں اپنے کار و بار سے
ہوں میں یوں اندر خیال عشق یار　　غیر استغراق کی ہو کچھ نہ کار

● فرمایا ایک شخص حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس عین دوپہر کے وقت آتے تھے۔ اور حضرتؒ کی نیند ضائع ہوتی۔ مگر حضرتؒ اپنی خوش اخلاقی سے کچھ نہ فرماتے۔ ایک روز حضرت حافظ ضامن صاحب شہید علیہ الرحمۃ کو تاب نہ رہی اور اس شخص کو سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ بیچارے درویش رات کو جاگتے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھوڑا سا سونے کا ہوتا ہے وہ تم خراب کرتے ہو۔ یہ کس قدر بے انصافی ہے۔ آخر کچھ لحاظ چاہیئے۔ حضرت حافظ صاحبؒ کی یہ تیزی بضرورت تھی۔ بعض اوقات اصلاح بجز سیاست اور سختی کے نہیں ہوتی۔ کسی کے پاس جانے میں اس کا خیال رکھے کہ اطلاع کر کے جاوے۔ اور عام بیٹھک میں بلا اطلاع جانا جائز ہے۔ اور لَاتَدْخُلُوا بُیُوْتًا سے مستثنیٰ ہے۔ مگر خاص خلوت کے وقتوں میں وہاں بھی نہ جانا چاہیئے۔ شاید تکلیف یا گرانی ہو۔ (حقوق المعاشرت ص۲۲)

● فرمایا ؎

این خورد گردد پلیدی زو جدا　　وان خورد گردد ہمہ نور خدا

یہ جو کچھ کھاتا ہے سب پلیدگی اور گندگی ہو جاتا ہے اور اللہ سے جدا ہو جاتا ہے، اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں سب خدا کا نور بنتا ہے۔ یعنی ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے۔ اور دوسرا کھاتا ہے تو اس سے نور خدا نکلتا ہے۔ میں جب حضرت حاجی صاحبؒ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ یہ محض شاعرانہ طور پر مولاناؒ نے فرمایا ہے کیونکہ فرق تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلتا۔ جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہؒ نے کیا

خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد اخلاق ذمیمہ ہیں اور نورِ خدا سے مراد اخلاق حسنہ ہیں۔ مطلب یہ کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو انکو اخلاق حمیدہ میں مدد ملتی ہے۔ اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے۔ (تفاضل الاعمال صـ۱۶)

● فرمایا: ایک شیخ بہت ہی کم گو تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے کہا آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ لوگوں کو فیض سے محروم رکھتے ہیں۔ خبر بھی ہے شیخ زبان ہوتا ہے اور مرید کان۔ اس پر ان کو تنبیہ ہوئی۔ پھر کلام فرمانے لگے۔ حقیقت میں عارف سے زیادہ گوئی کہاں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اسرار لامتناہی ہیں ان کو جتنا بھی بیان کیا جائے زیادہ گوئی نہیں ہو سکتی بلکہ ہمیشہ کمی رہے گی۔ پس زیادہ گوئی کے عذر سے شیخ کو چپ نہیں رہنا چاہیئے۔ (کمالات اشرفیہ صـ۲۰۳)

● فرمایا کہ میں نے حضرت حاجی صاحبؒ سے سنا ہے کہ ایک بزرگ مشغول بحق بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ اتفاقاً اس پر نظر پڑ گئی۔ ان بزرگ کی یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ اس نگاہ کا اس کتے پر اتنا اثر پڑا کہ جہاں وہ جاتا تھا اور کتے اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا۔ سارے کتے حلقہ باندھ کر اس کے اردگرد بیٹھ جاتے تھے۔ ہنس کر فرمایا وہ گویا کتوں کیلئے شیخ بن گیا۔ پھر فرمایا جن کے فیوض جانوروں پر ہوں اس سے انسان کیسے محروم ہو سکتا ہے۔ ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں دھن ہونی چاہیئے۔ چاہے تھوڑی ہی ہو۔ (کمالات اشرفیہ صـ۲۰۴)

● فرمایا: درود شریف میں حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے قبل لفظ سید نہ بڑھانے میں کمال متابعت ہے کیونکہ شارع سے منقول نہیں اور اگر کوئی کہے تو اس میں کمال محبت ہے۔ کمال ادب ہے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے جب حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت کی تو تب حضرتؒ نے فرمایا کہ کہو بیعت کی میں نے امداد اللہ سے تو مولاناؒ نے نہایت ادب سے حضرتؒ کا نام لیا اور کہا میں نے بیعت کی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے۔ اس پر حضرت حاجی صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا بس تم نے حقیقت کو سمجھا۔ ورنہ سب مریدوں نے صرف نام ہی لیا۔ حضرتؒ نے یہ جو فرمایا کہ تم نے حقیقت سمجھا کہ اس کا مطلب یہ تھا جن کو اب تک میں نے مرید کیا۔ انہوں نے صرف جس طرح میں نے اپنا نام لیا۔ بعینہٖ اسی طرح دہرا دیا۔ حالانکہ ان کو چاہیئے تھا کہ ادب کرتے کیونکہ میں تو اپنا نام ادب سے نہیں لے سکتا تھا۔ پس جس مسئلہ کا ذکر ہے، اسی کی تفسیر ہے۔ یہ واقعہ (انموذج الملفوظات حصہ دوم ملقب بہ سرمایۂ ہستی ملحقہ اشرف السوانح ج ۳ صـ۵۳۹)

● فرمایا: کہ حضرت حاجی صاحبؒ جب مثنوی پڑھاتے تو خوب زور شور سے تقریر فرماتے اور جب درس ختم ہو جاتا تو سر ٹپک کر بیٹھ جاتے کہ ارے بھئی کچھ شربت بناؤ۔ سرد و باد و بس یہ حالت تھی ۔

هرچند پیر خسته و بس ناتواں شدم   هر گہ نظر بسوئے تو کردم جواں شدم

اور ۔

خود قوی تر مے شود خمر کہن   خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

بڑھاپے میں قوت روحانی بڑھ جاتی ہے جو کیفیت کہ بڑھاپے میں بھی جاتی رہے تو وہ روحانی ہے۔ اور جو بڑھاپے میں زائل ہو جائے تو سمجھو کہ نفسانی تھی۔ گو محمود ہو۔ پہلے ذوقاً معلوم ہوتا تھا۔ اب بحمد اللہ بتحقیقت سمجھ میں آگیا۔ (ارواح ثلاثہ صـ۲۲۷)

● فرمایا: کہ حضرت حاجی صاحبؒ کا معمول تھا کہ جب مثنوی کا درس ختم فرماتے تو یوں دعا فرمایا کرتے تھے۔ اے اللہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے۔ اس میں ہمیں بھی حصہ دے ——— (ارواح ثلاثہ صـ۲۲۶)

● فرمایا: کہ جب حضرتؒ یہاں (خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون) میں تشریف رکھتے تھے تو ایک کچھالی میں کچھ چنے کچھ کشمش ملی ہوئی رکھتے تھے۔ صبح کے وقت مولانا شیخ محمد صاحبؒ حافظ محمد ضامن صاحبؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے۔ اور آپس میں خوب چھینا جھپٹی ہوا کرتی تھی۔ اس وقت مشائخ اس مسجد کو دکان معرفت کہتے تھے، اور تینوں کو اقطاب ثلاثہ[1]۔ حضرت حاجی صاحبؒ دہلی کے شہزادوں میں، علماء میں بزرگ مشہور تھے۔ مگر پیر بھائیوں سے چھینا جھپٹی کرتے تھے۔ (ارواح ثلاثہ صـ۲۲۸)

● فرمایا: کہ حضرت حاجی صاحبؒ بعض اوقات تمام تمام رات اس ایک شعر کو پڑھ پڑھ کر روتے روتے گزار دیتے تھے ۔ (ارواح ثلاثہ صـ۲۲۹)

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم سرِ من پیدا مکن

---

[1] افسوس اب ایسے لوگ کہاں رہے۔ ع اب ان کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں

● قولہ تعالیٰ: لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔ فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ کو تم پر رحم آتا ہے، تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حق تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اکثر اس کے فہم کے موافق کلام فرمایا ہے۔ یہاں بھی اسی کے موافق اَنْفُسَكُمْ فرما دیا ہے۔ یہی کلام خود اس قابل ہے کہ اس پر جان دے دی جائے۔ گو اس میں جان دینے کی ممانعت ہے۔ مگر جان نکلنا اور ہے جان دینا اور ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اس کو سن کر عشاق کی جان نکل جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ بعض آیات کو سن کر بعض عشاق کی جان نکل گئی اور اگر کسی نے خود جان دی ہے تو وہ پاگل یا مغلوب الحواس تھے۔ ان کا فعل حجت نہیں، گو وہ خود معذور ہوں۔ ان کو اولیاء مستہلکین کہتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کسی وجہ سے اپنے درجہ سے گر گئے۔ اس لئے غم میں جان دے دی۔ اور بعض وہ ہیں جو ترقی سے رہ گئے، ایک ہی مقام پر اٹک گئے۔ اور شطحیات ان سے صادر ہونے لگیں جنکی وجہ سے لوگوں نے قتل کر دیا۔ اور منصور بھی اولیاء مستہلکین میں سے تھے۔ حضرت غوث اعظم قدس اللہ سرہٗ کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہ کی۔ اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو میں ان کو اس ورطہ سے نکال دیتا۔ ہمارے حاجی صاحبؒ نے بھی اپنے بعض معاصرین کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ایک مقام پر اٹک گئے۔ اگر میرے پاس آجائیں تو میں ان کو نکال دوں۔ واللہ حاجی صاحبؒ بھی اپنے زمانہ میں عجیب پیر تھے آخر کوئی تو بات تھی جو عام عالم ان کے کمال کو تسلیم کئے ہوئے ہے۔ (تکمیل الانعام فی صورۃ ذبح الانعام ص۱۷)

مکتوبات حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب مرحوم شیخ الادب دارالعلوم

بنام حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ

تبرکات و نوادر

تاریخ ساز شخصیتوں کے نجی خطوط بھی تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں ان سے مکتوب نگار کے تاثرات اور طبعی صفات وخصائل پر روشنی پڑتی ہے اور بسا اوقات ان میں سے علم وحکمت اور واقعات وتاریخ کا مواد بھی مل جاتا ہے۔ برصغیر کے اعیان علم وفضل اور اکابر دین کے ایسے خطوط کا ایک کافی ذخیرہ دارالعلوم اور الحق کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ معلوم نہیں آئندہ کبھی مستقل اشاعت کا موقعہ ملے یا نہ ملے اس لئے بعض اکابر ملک وملت کے چیدہ چیدہ خطوط الحق میں شائع کئے جائیں گے تاکہ یہ نوادر اور اکابر کے تبرکات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہوسکیں، آج کی اشاعت میں حضرت شیخ الحدیث صاحب کے نام عالم اسلام کے ممتاز عالم استاذ العلماء شیخ الفقہ والادب مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند کے چند ایک مکاتیب پیش ہیں۔ وضاحتی نوٹ ایڈیٹر کے قلم سے ہیں۔ (ادارہ)

---★---

مولانا الفاضل العلام زیدت معالیکم

پس از سلام مسنون ابھی آپ کا والانامہ ملا۔ اس خبر سے اطمینان ہوا کہ قادر مطلق نے آپ کو مع الخیر والعافیت[1] وطن پہنچا دیا۔ فللہ الحمد والشکر والمنہ۔

آپ نے میرے احسانات کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے الفاظ جن کا تعلق صرف حسن ظن سے ہے۔ تحریر فرمادئے ہیں، مجھ کو تعجب ہے کہ قیام[2] دارالعلوم پر آپ کو تقریباً ایک سال گزرچکا اور اب تک آپ میرے قبائح سے ناواقف رہے۔ میرے بہت سے دوست ایسے ہیں کہ جب تک وہ دیوبند سے باہر رہے میرے عیوب[3] سے ناواقفیت کی وجہ سے میرے معتقد رہے۔ لیکن جب وہ دیوبند میں آئے اور میرے معائب ان پر واضح ہوئے، تو انہوں نے اپنی عقیدت کو بدعقیدگی سے بدل لیا۔ یہ امر آخر کہ بعض پر میرے سرائر جلد منکشف ہوگئے اور بعض پر بتاخیر۔ لیکن خدا نے آپ کو کیسا قلب صاف عطا فر

---

[1] تعطیلات رمضان گذارنے۔ [2] زمانہ تدریس دارالعلوم دیوبند۔ [3] لفظ لفظ سے شان تواضع اور اخفاء نفس عیاں ہے، ہمارے اکابر کی یہ ساری بزم من تواضع للہ۔ کی مظہر کامل ہے۔ " س "

ہے کہ آج تک بھی آپ نے میرے مقابع پر اطلاع نہ پائی۔ یا یہ کہ اطلاع پائی مگر عقیدت کو نہ بدلا۔ مجھ کو امید ہے کہ آئندہ سال آپ بھی اور صاحبوں کی طرح میرے مکتوبات کو بغور دیکھ کر اپنی رائے کی تصحیح کر لیں گے۔ میں آپ کا دعاگو ہوں۔ اور جب تک آپ دارالعلوم کی خدمت اسی طرح کرتے رہیں گے، جسطرح اب تک کی، میں آپ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔ میں بحمد اللہ اچھی طرح ہوں۔ رمضان المبارک کے متعلق مجھ کو تشویش تھی کہ خدانخواستہ اس کی برکتوں سے مجھ کو محروم ہونا پڑے گا۔ مگر منعم حقیقی کا ہزار ہزار شکر کہ میں بآسانی روزے رکھ رہا ہوں۔ برخوردارم قاری احمد میاں سلمہ۔ رشید میاں۔ حامد میاں سلمہ سلام عرض کرتے ہیں۔

والسلام محمد اعزاز علی غفرلہ از دیوبند

۲ رمضان سنہ ۶۳ھ شنبہ

عزیز مکرم زیدت معالیکم۔

پس از سلام مسنون آپ کا ملفوف تحریر کردہ یکم شوال کل ۲۷ ذی الحجہ کو ملا۔ دوسرے حضرات کی زبانی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے وہاں دورہ شروع کرا دیا ہے[1]۔ میری حالت تو نہ دریافت کرنے کے قابل اور نہ سننے کی لائق۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ ان خطرات[2] قویہ کے باوجود بھی ایک دن چین سے نہ بیٹھے آپ آجکل بذریعہ موٹر دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ غالباً ۱۷ نومبر کے بعد واپس ہوں گے۔ دارالعلوم دیوبند میں مفسدانہ افواہوں کے باوجود خیریت ہے۔ بعد از عشاء دارالعلوم کا پہرہ طلبہ تناوبا دیتے ہیں۔ آپ کی عدم موجودگی دارالعلوم میں بے رونقی کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اطراف میں فی الجملہ امن کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ امن ہو جاوے، تو آپ بعجلت ممکنہ تشریف لانے کا ارادہ کریں۔ رشید میاں سلمہ تو اوکاڑہ منڈی ملے ہیں۔ احمد میاں اور حامد میاں سلمہا سلام عرض کرتے ہیں۔

محمد اعزاز علی غفرلہ

۲۸ ذی الحجہ سنہ ۶۶ھ شنبہ

برادر عزیز زیدت معالیکم

پس از سلام مسنون کے جب سے آپ دیوبند سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس وقت سے پہلا لفافہ آپ کا ملا ہے۔ مجھ کو پتہ معلوم نہ تھا، ورنہ خود ارسال خدمت کرتا۔ ان چند ماہ میں جو حوادثات

---

[1] تقسیم کے بعد دیوبند میں پڑھنے والے چند طلبہ کے اصرار پر یہاں دورۂ حدیث شروع کرایا جس نے بعد میں دارالعلوم حقانیہ کی شکل اختیار کر لی۔

[2] تقسیم کے فوراً بعد کے ناگفتہ حالات مراد ہیں۔ خط پر ۱۵ نومبر ۱۹۴۷ء کی مہر ثبت ہے۔

گزرے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ جس سبعیت اور درندگی کا مظاہرہ اس عرصہ میں ہوا ہے، اسکی نظیر تاریخ کے کسی ایک ورق میں بھی نہ ملے گا۔ خون کی اس ارزانی اور انسانیت کی نایابی کا گلہ کس سے کریں۔ ع۔
کون سنتا ہے کہ فغانِ درویش ـــــ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ حسنِ خاتمہ نصیب کرے۔ آمین

آپ کی مفارقت تکلیف دہ ہے۔ میں اس پر مسرور رہا کرتا تھا۔ کہ آپ کا تعلق میرے ساتھ مخلصانہ ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی یہ توجہ آخرت میں کام آوے۔ آمین۔ میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اور چونکہ اجابتِ دعا کیلئے داعی کی اہلیت شرط نہیں ہے۔ اس لئے آپ کا دعا گو بھی ہوں۔ آپ کے حلقۂ درس میں جو حضرات بندہ کے پرسان حال ہوں۔ ان سے عموماً اور جناب مولانا مولوی اشرار الحق صاحب سے خصوصاً سلام فرمادیں۔ احمد میاں اور حامد میاں سلام عرض کرتے ہیں۔

زمنجنیق فلک سنگ فتنہ می بارد　　من ابلہانہ گریزم بآبگینہ حصار

محمد اعزاز علی غفرلہٗ از دیوبند
۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ

جناب محترم زیدت معالیکم

بعد از سلام مسنون آپ کا خط آیا آپ کے سعادتمندانہ الفاظ سے مسرت ہوئی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ حیاتِ طویلہ عطا فرماکر اپنی مرضیات کی توفیق بیش از بیش دے آمین ـــ آپ کی مفارقت کا صدمہ ہم خدام کو بھی کچھ کم نہیں ہے، لیسا اوقات آپ کا تذکرہ رہتا ہے۔ اور میں تو آپ کو اکثر ہی یاد کرتا ہوں۔ دارالعلوم کے طلبہ بھی آپ کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ میں اکابر کی کفش برادری کے طفیل میں پاکستان کے نقائص کو سمجھتا ضرور تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اس تقسیم سے ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے مسلمان اس درجہ تباہ ہونگے کہ ان کی تباہی ضرب المثل ہوگی اور دوست تو بجائے

۱؎ استاد کا خطاب شاگرد سے تواضع، شفقت اور ایسے ایسے طریقوں سے تلامذہ کو نوازنے کی مثالیں سلف ہی میں مل سکتی ہیں۔ ۲؎ تواضع اور بےنفسی کے ساتھ حکیمانہ نکتہ آفرینی۔ ۳؎ حکیم ڈاکٹر فاضل دیوبند ساکن اکوڑہ خٹک ۴؎ بڑے صاحبزادہ حال مدرس دارالعلوم دیوبند۔ ۵؎ دوسرے صاحبزادہ۔ ۶؎
۶؎ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

(س ح)

خود دشمن بھی ان کی تباہی سے محزون و غمگین ہوں گے، اور کوئی مفر نہ ہوگا۔ تدابیر کے نتائج معکوس ہوں گے[1]

ز منجنیق فلک سنگ فتنہ می بارد من ابلہانہ گریزم بآبگینہ حصار

دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ آمین

دارالعلوم میں بحمد للہ خیریت ہے، آج سے سہ ماہی امتحان شروع ہے جمعیۃ العلماء صوبہ سی پی کا اجلاس ۲۵، ۲۶ نومبر کو ناگپور میں ہو رہا ہے۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے ہیں۔ غالباً دس یوم کے بعد واپسی ہوگی۔ میں آپ کا خادم اور دعاگو بھی ہوں۔ بظاہر قریب الارتحال ہوں۔ اس لئے حسن خاتمہ کی دعا کا زیادہ محتاج ہوں۔ احمد میاں سلمہٗ۔ حامد میاں سلمہٗ سلام عرض کرتے ہیں۔ حضرت مولانا مولوی معراج الحق صاحب و عزیزم مولانا مولوی سید فخر الحسن صاحب بھی خیریت سے ہیں، سلام عرض کرتے ہیں۔

دعاگو اور طالب دعا

محمد اعزاز علی عفی عنہ از دیوبند

۳۰ صفر ۱۳۶۹ھ سہ شنبہ

---

[1] اور آج تو نتائج کی ظہور پذیری گویا مکمل ہوا چاہتی ہے۔ "س"

بقیہ: ہمارے اکابر ۔ حضرت کے وصال کے بعد پھر حضرت شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کی خدمت میں بخاری شریف بھی پڑھی۔ تمام اساتذہ خوش رہے، سند پر عمدہ الفاظ تحریر فرمائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی اسی سال سہارنپور سے آئے تھے، انہوں نے ترمذی شریف بخاری شریف ہمارے ساتھ ہی پڑھیں اور تقریریں بھی لکھیں۔ میں نے باقی فنون کی کتب اگلے سال دیوبند ہی میں پوری کیں۔ مقامات حریری مولانا بدر عالم نے مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے پڑھی اور شرح بھی لکھتے رہے۔ میں بھی ترمذی شریف اور بخاری شریف کی تقریر لکھتا تھا۔ بیعت حضرت مولانا فقیر اللہ صاحبؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے کرا دی تھی۔ میرے جیسا نجس اور ناپاک آدمی حضرت مفتی صاحب کا احسان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے سفارش کی حضرت اسکو بیعت فرمالیں حضرتؒ نے فوراً قبول فرمالیا اور بیعت کر لیا۔ پھر احقر حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ پھر ۱۹۳۸ء میں حضرت رائے پوریؒ سے بیعت ہوگیا یہ حضرت کی شفقت ہے کہ احقر کو رائے کوٹ سے بلا کر بیعت فرمالیا۔

احمد سعید ایم اے او کالج لاہور

حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ امرتسری

حضرت مفتی صاحب کے ایک خادم خاص نے حج کیلئے درخواست دی۔ یہ صاحب مفتی صاحب کو جب مفتی صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، مکان کی بالائی منزل سے نیچے لاتے اور اوپر لے جاتے تھے۔ جب ان صاحب کا قرعہ اندازی میں نام نہ آیا تو اور مسلمانوں کیطرح ان کو بھی صدمہ پہنچا۔ حضرت مفتی صاحب کو ان کی پریشانی کی اطلاع دی گئی۔ حضرت نے انکو اپنے پاس بلایا اور پوچھا "چوہدری صاحب نام نہیں نکلا" چوہدری صاحب نے نہایت رنج اور دکھ کے عالم میں کہا "نہیں"۔ اس پر حضرت نے فرمایا: "بس تو پھر حج ہو گئی" اور اس فقرہ کو کئی مرتبہ دہرایا۔ بعد میں فرمایا "آپ کو تو گھر بیٹھے حج کا ثواب مل گیا۔ عمل کا دارومدار تو نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گھر بیٹھے حج کرا دیا ہے"۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مفتی صاحب کے تعلقات اور ربط قلبی کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کے ایک خادم جو مفتی صاحب کے قریبی عزیز بھی تھے انہوں نے حضرت تھانویؒ کی علالت کے متعلق مفتی صاحب کو اطلاع دی۔ مفتی صاحب حضرت تھانویؒ کے پاس تھانہ بھون تشریف لائے اور تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا۔ اسی دوران حضرت تھانویؒ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور حضرت مفتی صاحب واپس تشریف لے گئے۔ حضرت تھانویؒ کی خانقاہ میں پنجاب کے ایک بزرگ سائیں طور شاہ جو اونچا سنتے تھے، اور نہایت نیک لوگوں میں شمار ہوتے تھے حضرت تھانویؒ سے ارشاد کیا:

"حضرت خلیفہ جی چلے گئے خانقاہ کی رونق کم ہو گئی ہے"۔ اس پر ارشاد فرمایا: "ہاں سائیں جی میں بھی محسوس کرتا ہوں"۔

جب مفتی صاحب کے پاؤں کی بیماری کا آغاز تھا، تو اس وقت ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ حضرت کا پاؤں قطع کر دیا جائے۔ اس واقعہ کا ذکر حضرت تھانویؒ سے کیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب

کے پاؤں کے قطع کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا: "مولوی جی سچ عرض کرتا ہوں کہ جب مولوی محمد حسن کے پاؤں قطع کرانے کا تصور آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے، گویا میرا اپنا پاؤں قطع کیا جاتا ہو۔"

اس کے بعد مولانا شبیر علی تھانوی صاحب سے فرمایا: "بھائی کوئی ایسی دوا نہیں کہ جس سے مولوی صاحب کے پاؤں کو آرام آجائے۔" مولوی شبیر علی صاحب نے فرمایا: "حضرت یہ بیماری مدراس میں ہوتی ہے۔ سنا ہے اس کے لئے ایک بوٹی ہوتی ہے۔ جس سے آرام آجاتا ہے۔" حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اگر یہ بوٹی مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ شبیر علی تھانوی صاحب نے یہ بوٹی مدراس سے منگوا کر اس کو گملے میں لگا کر اسکی دوا بنا کر مفتی صاحب کو بھیجی۔ اس تمام عرصہ کے دوران حضرت تھانویؒ بار بار استفسار فرماتے رہتے کہ دوائی بن گئی ہے یا نہیں۔ اور تمام عرصہ اس میں دلچسپی لیتے رہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کی مجلس میں بہت بڑے جیّد علماء موجود ہوتے تھے، وہاں علم و فضل کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن اگر حضرت مفتی صاحب موجود نہ ہوتے تھے تو حضرت تھانوی فرماتے تھے "اگر مولوی محمد حسن امرتسری یہاں ہوتے تو وہ بہت خوش ہوتے۔"

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب نے حضرت تھانوی کی خدمت میں مچھلی بھیجی۔ آپ نے مچھلی کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ اور جس شخص کے ہاتھ یہ روانہ کی تھی اسکو ہدایت کر دی تھی کہ ایک حصہ چھوٹے گھر کا ہے اور دوسرا حصہ دوسرے گھر اور تیسرا حصہ اس گھر کا جہاں حضرت کی باری ہوگی۔" جب حضرت تک مچھلی پہنچی اور اس تقسیم کی بھی خبر ملی تو بہت خوش ہوئے اور کئی روز تک اس واقعہ پر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ فرمایا: "اس سے زیادہ میری اور کون رعایت کر سکتا ہے۔"

حضرت مفتی صاحب کے ملنے والوں میں دو بھائی تھے۔ یہ دونوں بھائی آپس میں نہایت خلیق اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن درمیان میں جائیداد کی وجہ سے آپس میں رنجش پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن چونکہ دونوں میں محبت بھی بہت تھی۔ اس لئے ایک دوسرے کا لحاظ بھی کرتے تھے۔ اس وجہ سے دونوں کو بہت پریشانی تھی۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ "حضرت بڑی پریشانی ہے۔" اس پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "بھائی اصل پریشانی اور راحت تو آخرت میں ہوگی۔ اگر ایمان کے ساتھ خاتمہ ہوا تو اصل راحت تو آخرت میں ہوگی۔

جب مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تو اس کے بعد جب آرام آنے لگا تو ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کا ہاتھ حرکت کر کے سر تک پہنچ گیا۔ اس پر جملہ حاضرین نہایت خوش ہوئے کہ ہاتھ حرکت کرنے لگا ہے۔ حاضرین کی اس خوشی کو دیکھ کر فرمایا۔ اس فالج کی وجہ ایک اور علم کا اضافہ ہوا ہے کہ پہلے تو ہاتھ ہی کو اللہ کی نعمت سمجھتا تھا، اب معلوم ہوا کہ ہاتھ کی حرکت اللہ کی ایک مستقل نعمت ہے۔ اسی طرح اگر آدمی غور کرے تو معلوم ہوتا ہے کہ کھانا بھی ایک نعمت ہے، لیکن بھوک کا لگنا بھی ایک مستقل نعمت ہے۔ آنکھ ایک نعمت ہے لیکن نظر ایک مستقل نعمت ہے۔ آخر میں فرمایا بھائی اللہ کی نعمتوں کو کوئی کہاں تک بیان کرے۔ ان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا۔

ایک مرتبہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد سے واپس آرہے تھے تو جامعہ نیلا گنبد کے سامنے بچوں کے سکول میں چھٹی ہوئی۔ بچے چھٹی کی خوشی میں شور مچاتے ہوئے سکول سے بھاگتے ہوئے نکل رہے تھے۔ حضرت ان کی بھیڑ سے بچنے کے لئے ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ دیکھو بچے جب سکول سے نکل کر آرہے ہیں تو کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔ یہ پڑھائی کو اپنے لئے مصیبت سمجھتے ہیں۔ اس سے نجات پر کس قدر خوش ہو رہے ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ قیامت میں مومنوں کو یہ فرمائیں گے کہ تمہاری نجات ہو گئی تو اس وقت ان کو کس قدر خوشی ہو گی۔

مولانا روم کے اس شعر کی تشریح میں ایک مرتبہ فرمایا ؎

گفت ایں اللہ تو لبیک ماست   ایں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

فرمایا کہ اس شعر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب بندہ یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جواب دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسکو دوبارہ اپنا نام لینے کی توفیق عطا فرماتے ہیں جب بندہ ایک دفعہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اگر اسکو دوبارہ توفیق مل جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے اس کو جواب دیا۔ لیکن اگر آدمی غور کرے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود پہلے یاد کرتے ہیں بندہ بعد میں ان کو پکارتا ہے۔ آدمی یہ سوچے کہ اسکو یاد کرنے کا دھیان کس نے دل میں ڈالا ہے۔ کیا یہ خیال خود ہی پیدا ہوتا ہے یا کوئی پیدا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے خود اپنا دھیان دل میں پیدا کرتے ہیں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشگی عطا فرماتے ہیں پھر اپنے ایک عزیز کو فرمایا کہ اسکو لکھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہمیشگی عطا فرماتے ہیں۔ ■■

وحید الدین خان

ہمارا جسم خدا کی گواہی دے رہا ہے

غیر معمولی حکمت اور معنویت جو ایک خالق کا تقاضا کرتی ہے

★

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے، ہم کو تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے ملبورن کے لیئے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے —— یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (NERVOUS SYSTEM) ہے جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے۔ اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروڑوں خبریں ادھر سے ادھر دوڑتی رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے۔ مختلف اعضاء کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں۔ پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے۔ اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا بھیجا ہے۔ آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خلئے (NERVECELLS) ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (NERVE FIBRES) کہتے ہیں۔ ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرتے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے، انہیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، اور دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور سارا عمل کرتے ہیں۔ زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (TESTE-BUDS) ہیں جن میں ہر ایک اپنے علٰحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ انہیں کے ذریعہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے۔ کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سماعتی خلئے ہوتے ہیں۔ انہیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے۔ ہر آنکھ میں ۱۳۰ ملین (LIGHT RECEPTORS) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں ہماری تمام جلد

میں حسیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً تیس ہزار "گرم خانے" اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے جسم کانپنے لگتا ہے۔ جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں۔ فوراً مزید خون ان رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہنچائی جاسکے۔ اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں اور تین ملین پسینہ کے غدود (GLANDS) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام کی کئی تقسیمیں ہیں۔ ان میں سے ایک (AUTONOMIC BRANCH) ہے یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہضم سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ۔ پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک کا نام ہے مشارک نظام (SYMPATHATIC SYSTEMS) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے اور دوسرا (PATASYMPATHATIC) ہے جو روک کا کام کرتا ہے۔ اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو مثال کے طور پر دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آجائے اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے، دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہے۔ جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو SYMPATHATIC کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح نیند کے وقت PARASYMPATHATIC کا غلبہ ہوتا ہے جب کہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

(مزید تفصیل کے لئے ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

اس طرح کے بیشمار پہلو ہیں اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قائم ہے جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر سے بہتر نظام بھی مات ہے۔ اور اب تو قدرت کی نقل سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے۔ اس سے پہلے سائنس کا میدان صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہوتی ہیں ان کو دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگر اب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کا میکانکی نقل کو خاص اہمیت دی جارہی ہے۔ اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا ہے جس کو بایونکس (BIONICS) کہتے ہیں۔ بایونکس حیاتیاتی نظام (BIOLOGICAL SYSTEMS) اور طریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہے کہ جو معلومات حاصل ہوں انہیں انجنیئرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹکنالوجی میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کیمرہ دراصل بنیادی طور پر آنکھ کی میکانکی نقل ہے۔ کیمرے کا لنس (LENS) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے ڈائفرام (DIAPHRAGM)

پردہ شبکی (IVIS) ہے۔ اور روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے، جس میں عکس دیکھنے کے لئے ڈوریے اور مخروطی شکلیں ہوتی ہیں۔ ماسکو یونیورسٹی میں زیر صوتی ارتعاش معلوم کرنے اور اس کی پیمائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا ہے جو طوفان کی آمد کی اطلاع ۱۲ سے ۱۵ گھنٹے پہلے تک دیدیتا ہے۔ یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقتور ہے۔ اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ جیلی مچھلی نے۔ انجینئروں نے اس کے اعضاء کی نقل کی جو زیر صوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔

SOVIET LAND , DEC. 1963

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ طبیعاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوتے ہیں۔ قدرت ان کو مدتوں پہلے حل کر چکی ہے پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اسی طرح یہ بھی ناقابل تصور ہے کہ کائنات کا پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو۔ کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینئر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی کا نام خدا ہے۔ ہم کو جو ذہن ملا ہے وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لئے ایک ناظم کا اقرار کریں، بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم اس تنظیم کے ناظم کو ماننے سے انکار کر دیں حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

لہ کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے" مگر اس کے باوجود دنیا کے بہت سے ہوشمند یہ یقین رکھتے ہیں کہ آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے۔"

بقیہ ختم نبوت :۔ نے اپنی تقریر کا الحاصل بیان کرتے ہوئے کہا، آج ضرورت ہے اس عقیدہ کو محکم رکھنے کی جو ایمان کی بنیاد ہے اور جہاں سے اسلام کا صحیح تصور ہمیں مل سکتا ہے۔ یعنی نبوت اور ختم نبوت کیونکہ عقیدہ کے بغیر کوئی عمل درست نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا: اوصیکم بتقوی اللہ۔ میں تمہیں خدا سے ڈرتے رہنے کو کہتا ہوں۔ یاد رکھو سرحد میں انتخابات ہونے والے ہیں میں کہوں گا کہ لیگ کی پوری طرح حمایت کرو۔ اس کے ہر امیدوار کو کامیاب بناؤ۔ مگر جھوٹے نبیوں کے پیروکاروں کو پوری طرح شکست دو۔ لیگ کے ہر امیدوار کو خواہ وہ کوئی ہو اور کیسا ہی ہو۔ تم ووٹ دے دو۔ مگر پنجابی نبی کے چیلوں کو سر اٹھانے کا موقعہ نہ دو، ان کی ضمانتیں ضبط کراؤ، اور انہیں شکست فاش دو۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ۔

یاد رفتگان

(ادارہ)

حضرت مولانا محمد انوری صاحب لائلپوری رحؒ

سوانح ــــــ بیماری ــــــ سفر آخرت

۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامہ میں ہجرت کر کے لائل پور تشریف لائے اور اپنے مرشد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق لائل پور میں آتے ہی دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی جو کہ تقسیم ملک سے قبل رائے کوٹ ضلع لدھیانہ میں جاری تھا۔ مدرسہ میں حفظ القرآن کے علاوہ ابتدائی کتب عربی سے دورہ حدیث تک کی تعلیم شروع کرائی خود سارے اسباق دورہ کے پڑھاتے تھے، صبح تین بجے سے شروع کر کے رات ۱۱ بجے تک پڑھانا معمول تھا۔ اس محنت و مشقت کی وجہ سے ذیابیطس وغیرہ امراض کے شکار ہوئے، لیکن کام میں سستی نہ آنے دی۔ آخر ۱۹۶۲ء میں فالج کا شدید حملہ ہوا پھر ۱۹۶۵ء میں دوسرا حملہ ہوا، مرض شدت اختیار کر گیا، آخر اسباق چھوڑ دئیے، لیکن باوجود اس قدر ضعف اور پیرانہ سالی کے اپنے اوراد و وظائف میں انہماک اس طرح رہا کہ گرمیوں سردیوں میں تہجد کے لئے رات ۱۲ بجے اٹھنا! ایام بیض ہر جمعہ کا روزہ معمول رہا۔ آخر مرض نے اور شدت اختیار کی ۹/۲ کو بعد از نماز جمعہ قلب کا شدید دورہ ہوا جو کہ جمعہ سے عصر تک رہا۔ پہلے دورہ کے بعد اپنے صاحبزادے مولانا سعید الرحمان سے فرمایا کہ یہی مرض آخر میں میرے مربی و شفیق استاد مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کو ہوا تھا۔ مجھے اپنے استاد و شیخ سے نسبت خاص ہے۔ قلب کا دوسرا دورہ ۹/۱۳ جو کہ عصر سے عشاء تک رہا۔ تیسرا دورہ قلب ۹/۱۶ بعد از نماز عشاء تا ۱۲ شب تک رہا۔ تو رات ۲ بجے اپنے لواحقین کو بلا کر وصیتیں فرمائیں۔ اللہ کا خوف ہر حالت میں رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلنے کی پوری سعی کرنا۔ میرے احباب سے حسن سلوک رکھنا آپس میں محبت و سلوک سے رہنا۔ ۹/۲۰ دن کے وقت طبیعت مبارکہ میں بہت خشیت الٰہی کا غلبہ تھا اور ملاقات ربانی کے شوق میں اشعار پڑھتے تھے۔ ۹/۱۹ بروز پیر حجام کو بلانے کا فرمایا۔ تو عرض کیا گیا کہ جناب ہمیشہ جمعرات کو حجامت بنوایا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ نہیں اس دفعہ پیر کے دن ہی بنوانی ہے۔

اور جمعرات میں کتنے دن باقی ہیں۔ صبح و شام پوچھتے رہے۔ آخر ۲۰؍ بعد از نماز عصر طبیعت مبارکہ پر نقاہت کا غلبہ بہت تھا۔ مولانا عبدالجلیل صاحب نے عرض کیا حضرت زبان مبارکہ خشک ہو رہی ہے۔ خمیرہ مروارید میں آب زمزم ملا کر دوں۔ فرمایا ہاں ضرور دو، پی کر فرمایا الحمدللہ سینہ سیراب ہو گیا پھر فرمایا زمزم پیا اور روح پرواز کر گئی۔ پھر مغرب کی نماز باجماعت پڑھنا شروع کی، آخری التحیات میں نقاہت بہت ہو گئی، سلام بمشکل پھیرا کہ استغراق کی حالت ہو گئی۔ حالت استغراق میں ہی بدھ کا پورا دن گذرا۔ تھوڑی دیر بعد شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے تھے، یوں ہی بدھ ۲۱؍ کا پورا دن گذرا۔ جمعرات کی رات ۱۱ بجے طبیعت مبارکہ میں زیادہ کمزوری کے آثار نظر آئے تو ڈاکٹروں کے تقاضے پر سیڈ کواٹر ہسپتال لائل پور میں پرائیویٹ وارڈ میں لے جایا گیا۔ پوری رات شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھتی رہی۔ آخر صبح ۷ بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جنازہ ۸ بجے ایمبولینس پر رکھ کر مکان واقع سنت پورہ لایا گیا۔ غسل کے دوران سب نے محسوس کیا کہ چہرہ انور پر مسکراہٹ اور بشاشت بہت تھی اور جسم مبارک سے گلاب کی سی خوشبو آ رہی تھی غسل سے فراغت کے بعد آپ کے مکان کی ڈیوڑھی میں جنازہ رکھا گیا تو لوگ روتے جاتے تھے زیارت کرتے جاتے تھے قریباً ایک لاکھ افراد نے زیارت کی ہو گی۔ اعلان کے مطابق شام ۴½ بجے اقبال پارک دھوبی گھاٹ میں غالباً ۱½ لاکھ افراد نے نماز جنازہ پڑھی اور جنازہ کا جلوس بڑا قبرستان لائل پور کی طرف روانہ ہوا۔ حد نگاہ تک انسانوں کا سمندر موجیں مارتا ہوا جا رہا تھا، آخر سسکیوں اور آہوں میں ۵½ بجے شام لحد میں اتار دئے گئے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

جنازہ میں ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے اکابر علماء صلحاء حفاظ و دیگر معززین نے شرکت کی، مقامی حضرات نے دکانیں بند کر دیں۔ شہر میں ہڑتال کی سی کیفیت تھی۔ جمعہ ۲۳؍ بعد از نماز عشاء جامع مسجد النوری میں جلسہ تعزیت منعقد ہوا جس میں مفتی زین العابدین خطیب لائل پور، مولانا محمد ضیاء القاسمی مولانا تاج محمود کے علاوہ دیگر حضرات نے تقاریر فرمائیں۔ اور مولانا کی خدمات کو سراہا، آخر میں مولانا مرحوم کے ارشاد کے مطابق مولانا مرحوم کے بڑے سے چھوٹے صاحبزادے حافظ مولانا سعید الرحمن کو آپ کا جانشین مقرر کیا گیا۔ مولانا نے ۵ صاحبزادے تین صاحبزادیاں، اور ایک بیوہ چھوڑی ہیں۔

خود نوشت سوانح | حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری مرحوم کے خلفاء مجازین کا تذکرہ لکھتے ہوئے مولانا مرحوم نے اپنی سوانح پر بھی اس میں روشنی ڈالی ہے، جو مختصراً نقل کی جا رہی ہے۔

احقر کی پیدائش مئی ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور حضرت مولانا محمد صاحب قدس سرہٗ والد صاحب پر بے حد

مہربان اور حضرت گنگوہی کے اجلہ خلفاء میں سے تھے اور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کے تلمیذ تھے اور مولانا شیخ عبدالحق مصنف تفسیر حقانی کے ہم سبق تھے، کوٹ بادل خاں ضلع جالندھر میں رہتے تھے، میرے عقیقے پر تشریف لائے تھے۔

حضرت مولانا محمد صاحبؒ نے فرمایا کہ اپنے نام پر نام میں سے محمد رکھدیا ہے۔ اور برکت کی دعا فرمائی، میں ابھی چھ ماہ کا ہوں گا کہ والد صاحب مرحوم کو زمین ضلع لائل پور میں ملی۔ حضرت مولانا محمد صاحبؒ کا انتقال اسی سال ہوا، والد صاحب ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے کہ اطلاع ملی۔ میری والدہ ماجدہ کا انتقال ضلع لائل پور کے ایک گاؤں چک ۲۴۸ گ ب میں ہوا، پانچ سال کی عمر میں قرآن عزیز ناظرہ پڑھا۔ حافظ محمد عمرؒ جالندھری ہمارے گاؤں میں رہتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے طبیب اور حافظ قرآن تھے۔ با تجوید قرآن عزیز پڑھتے تھے، کئی سال رہ کر پھر اپنے وطن مالوف جالندھر شہر میں واپس تشریف لے گئے اور وہاں انتقال فرمایا۔ میں غالباً چھٹی جماعت میں داخل ہو گیا تھا کہ والد صاحب نے مجھے فارسی شروع کرا دی پھر بوستان تک گھر ہی میں پڑھتا رہا۔ ایک دفعہ کہنے سے سبق یاد ہو جاتا تھا، مگر والد صاحب مرحوم جب ایک سو بار سبق یاد کر لیتا تھا تو چھٹی دیتے تھے۔ کتابیں مجھے حفظ یاد ہو گئیں تھیں۔ پھر سکندر نامہ اور یوسف زلیخا جامع قواعد احسن القواعد نیرنگ عشق رائے پور گوجراں ضلع جالندھر مولانا مفتی فقیر اللہ صاحبؒ کے پاس پڑھیں۔ مولانا فضل احمد صاحب نے صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ نفحۃ الیمن قلیوبی سبعہ معلقات مولانا مفتی فقیر اللہ صاحبؒ سے پڑھیں اور حافظ محمد صالح صاحبؒ کے گھر میں رہتا تھا۔ مولانا فقیر اللہ صاحبؒ کا نکاح ابھی نہیں ہوا تھا پھر مولانا کا نکاح ہو گیا۔ اور میں روٹی مولانا موصوف کے گھر میں کھانے لگا۔ والد صاحب مرحوم ماہوار خرچ مولانا کی خدمت میں ارسال کر دیتے تھے اگلے سال پھر طبیعت اچاٹ ہو گئی پھر دو سال پڑھنا چھوڑ دیا تیسرے سال پھر کتابوں کو دہرایا۔

غرض پنجاب کے مختلف مدارس میں رہ کر کتابیں پڑھتا رہا۔ پھر مشکوٰۃ شریف مولانا مفتی فقیر اللہ صاحبؒ سے پڑھی، پھر حضرت شیخ الہندؒ کی آمد آمد سن کر دیوبند شریف حاضری ہوئی ۱۳۳۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ سے ترمذی شریف مسلم شریف کا کچھ حصہ اور بخاری شریف پڑھی، مولانا حافظ محمد احمدؒ سے مسلم شریف پوری کی، ابو داؤد شریف حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ سے پڑھی اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن سے باقی کتب حدیث پڑھیں، رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مفتی صاحب نے ہمیں سند حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی عنایت فرمائی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہمیں بخاری شریف پڑھائیں گے۔ لیکن حضرت سخت بیمار ہو گئے پھر وصال ہو گیا حسرت ہی رہ گئی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

باقی صفحہ ۳۷ پر

جناب مولانا محمد محترم فہیم صاحب ایم اے ۔ لاہور

کائنات میں انسان کی حیثیت

موجودہ دور کا انسان جس شدید قسم کے ذہنی خلفشار سے دوچار ہے اسکی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں اپنا صحیح مقام متعین کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مادی لحاظ سے جس قدر اس نے ترقی کی ہے اسی قدر بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ روحانی اعتبار سے نظریاتی دیوالیہ پن کا شکار ہوتا چلا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی فلاح کے جتنے راستے بھی اس نے اپنی عقل سے متعین رکھے وہ اسکو فلاح کی طرف لے جانے کی بجائے بالآخر اسکی تباہی و بربادی پر منتج ہوئے ہیں۔ ہر راستے کے اختتام پر اس نے یہی دیکھا کہ جہاں سے چلا تھا ابھی وہیں ہے۔ ہر بار یہ حقیقت پوری طرح کھل کر اس کے سامنے آگئی کہ اپنی عقل سے جو راستہ اس نے اپنے لئے چنا تھا وہ محض بھول بھلیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ اور یہ سب کچھ منطقی نتیجہ کے طور پر ہوا یہی کچھ ہونا تھا اس پر حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ انسان کی عقل محدود ہے، وہ اپنی حدود کے اندر رہ کر ہی انسان کی بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکتی ہے۔ انسان کی زندگی کے تمام گوشے اس پر عیاں نہیں ہیں وہ انسان کے ماضی سے فائدہ اٹھا کر کچھ نتائج تو اخذ کر سکتی ہے لیکن انسان کا مستقبل اس کے لئے محض تاریکی ہی تاریکی ہے آئندہ کے حالات و واقعات کا نہ اسے کوئی علم اور نہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارنے یا بگاڑنے پر اسے کچھ قدرت۔ یہی وجہ ہے کہ عقلی بنیادوں پر استوار فلسفہ ہائے زندگی کو ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انسان کی فلاح کا صحیح ترین اور مفید ترین راستہ وہی ہو سکتا ہے جو کسی ایسی ہستی کا متعین کیا ہوا ہو جس پر نہ صرف انسان کی زندگی کے تمام گوشے منور ہوں بلکہ انسان کا ماضی و مستقبل بھی اس کے لئے یکساں حیثیت رکھتا ہو اور انسان کی فلاح کا راستہ ایک مرتبہ متعین کر دینے کے بعد وہ ہستی اس راستے کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے پر بھی پوری پوری قدرت رکھتی ہو۔ ایسی ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی ـــــ وہ

عالم الغیب والشہادۃ اور قادر مطلق ہے۔ اسی کا متعین کردہ راستہ انسانی فلاح کے لئے صحیح ترین اور کامیاب ترین راستہ ہے اور تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جب کبھی اور جہاں کہیں انسانوں کے کسی گروہ نے اللہ تعالیٰ کا متعین کردہ راستہ اختیار کیا فوز و فلاح نے ان کے قدم چومے۔ مگر وہیں اس نے اس راستے میں اپنی عقل کو دخل دیا یا اس جادۂ حق سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ تلاش کرنے کی کوشش کی اس نے منہ کی کھائی اور حرمان و خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس وسیع کائنات میں انسان کی کیا حیثیت ہے۔؟ یہ ایک ایسا فطری سوال ہے جو انسان کے ذہن کو اسکی ابتدائے آفرینش سے پریشان کرتا رہا ہے اور یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش نے مختلف مذاہب کو اور مختلف فلسفہ ہائے زندگی کو جنم دیا۔ تمام مذاہب کی تعلیمات میں خواہ وہ مذاہب آسمانی ہوں یا غیر آسمانی اس سوال کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی پہنچ کے مطابق ہر مذہب نے اس سوال کا جواب دیا ہے یہ سوال اتنا اہم ہے کہ انسان کی عملی زندگی کی پوری عمارت اور اس وسیع کائنات میں اس کے صحیح یا غلط کردار کا پورا ڈھانچہ اسی ایک سوال کے جواب کی بنیادوں پر منحصر ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مذاہب کی کل تعلیمات اسی ایک سوال کے جواب کے گرد گھومتی ہیں۔ جب یہ سوال اتنی اہمیت کا حامل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہی مذہب کامیاب ترین مذہب قرار دیا جا سکتا ہے جو اس سوال کا صحیح صحیح اور انسانی فطرت کے عین مطابق جواب دے ایک ایسا جواب جو اپنی جزئیات میں تضاد سے پاک ہو اور اس کائنات کی فطری روش اور انسان کی عملی زندگی کے درمیان پوری پوری ہم آہنگی پیدا کرنے کا موجب ہو گویا کسی مذہب کا حق ہونا یا اس کا باطل ہونا اسی ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ جس طرح اور مذاہب نے اس سوال سے بحث کی ہے اسی طرح مذہب اسلام میں بھی یہ سوال بنیادی اور مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ مگر اس سوال کے جواب میں جس طرح دیگر مذاہب نے ٹھوکریں کھائی ہیں اسلام کا دامن نہ صرف اس سے بالکل پاک ہے بلکہ اس نے اس سوال کا ایسا صحیح اور مکمل و مدلل جواب دیا ہے کہ اس سے بہتر جواب ممکن ہی نہیں جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کائنات کی فطری روش سے پورا پورا ہم آہنگ ہے جسکو عقل انسانی نہ صرف یہ کہ من وعن قبول کرنے پر مجبور ہے بلکہ اس سے بہتر جواب کے تصور سے بھی عاجز ہے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام نے انسان کو اس وسیع کائنات میں کیا مقام عطا کیا

ہے اور دیگر مخلوقات عالم کے درمیان اسے کس حیثیت کا حامل ٹھہرایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ہم ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں، کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اس سوال کے جواب میں ماسوائے اسلام کے تقریباً ہر مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے اس لئے اسلام کے پیش کردہ جواب کی اہمیت اور اس کا مقام بلند شاید اس وقت تک پوری طرح واضح نہ ہو جب تک ہم اس بارے میں دیگر مذاہب کی لغزشوں سے واقف نہ ہو جائیں اور یہ نہ جان لیں کہ ان مذاہب نے کائنات میں انسان کو جو حیثیت دی ہے، وہ کس قدر انسانی فطرت کے خلاف اور کس قدر عقل کے اصولوں کے منافی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ہندو دھرم کو لیتے ہیں، کیونکہ اس مذہب کے علمبرداروں کو اس کے بارے میں سب سے قدیم مذہب ہونے کا دعویٰ ہے۔ ہندو دھرم انسان کو ایک مجبور و بے بس حقیر شے سمجھتا ہے وہ فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں انسان کو کمزور اور بے بس دیکھتا ہے تو بے دھڑک حکم لگا دیتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے، نفع و نقصان پہنچانے والے ظاہری اسباب پر اسکی نظر پڑتی ہے اور سبب اصلی کی کھوج لگائے بغیر وہ انسان کو ان نافع و ضار قوتوں ہی کا متبوع و محکوم سمجھ بیٹھتا ہے۔ اسکی نظر سے انسان کی وہ حیثیت بالکل ہی اوجھل ہوگئی جسکی بنا پر اسے تمام کائنات پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ ہندو دھرم انسانی زندگی کا صرف تاریک پہلو ہی دیکھ سکا ہے۔ اسکی زندگی کے روشن پہلو پر اسکی نظر ہی نہ پڑ سکی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ انسان اس نظریہ پر ایمان رکھ کر اپنی اصل حقیقت ہی سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ کائنات میں موجود دیگر لاتعداد حقیر و معمولی اشیاء کی طرح اس نے اپنے آپ کو بھی ایک حقیر ترین ہستی جانا اور ہر اس دنت کے سامنے سر بسجود ہوگیا جو کسی لحاظ سے بھی اسے اپنے سے بدتر نظر آئی۔ نہ صرف چاند سورج پہاڑ دریا طوفان آندھی جیسے مظاہر فطرت کو وہ اپنا معبود بنا بیٹھا بلکہ مٹی اور گارے کے ان پتلوں کے سامنے جھکنے میں بھی اسے کوئی عار نظر نہ آیا جو خود اس کے اپنے ہاتھوں کی بدولت وجود پاتے تھے۔ غور کا مقام ہے کہ کائنات میں جو حیثیت انسان کو ہندو دھرم دیتا ہے اس پر یقین رکھ کر ایک لمحہ کیلئے بھی انسان بطور انسان کے زندگی بسر کر سکتا ہے؟ کیا اینٹ پتھر سے زیادہ انسان کی کوئی حیثیت پھر باقی رہ جاتی ہے۔ کیا یہ نظریہ انسانی فطرت کی عین ضد نہیں اگر تمام نوع انسانی اس نظریہ پر ایمان لے آئے تو کیا اس کائنات کے درہم برہم ہونے میں کوئی شک رہ جاتا ہے۔ غور کیجئے اس سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی اور نظریہ ہو سکتا ہے؟

ہندو دھرم کے بعد بدھ مذہب کو سب سے قدیم مذہب شمار کیا جاتا ہے، وہ انسان کو اور اس کائنات کو محض دکھوں کا ایک مجموعہ خیال کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات کا سارا کارخانہ صرف اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو رنج و غم پہنچائے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر وہ سمجھتا ہے کہ اس ابدی رنج اور تکلیف سے نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان اپنی خواہشات ترک کر دے اور اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہ رکھے۔ نتیجہ اس نظریہ کا بھی یہی ہوا کہ انسان اس کائنات میں انسان کی حیثیت سے اپنا کوئی مقام متعین نہ کر سکا، وہ دنیا کو تیاگ بیٹھا نفس کشی اور ریاضت سے اس نے از خود اپنے تمام احساسات کو باطل کر لیا، اور اس کائنات میں ایک عضو معطل ہو کر رہ گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بھی انسانی فطرت اور اس کائنات کی فطری روش سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کا مطلب اس کارخانۂ کائنات کے تعطل محض کے سوا اور کچھ نہیں۔

عیسائیت آئی اور اس نے انسان کی حقیقت کے بارے میں ایک اور ہی اچھوتا نظریہ پیش کیا۔ یہاں یہ خیال رہے کہ عیسائیت سے ہماری مراد وہ عیسائیت ہے جس کے اصل بانی مبانی حضرت عیسیٰ نہیں بلکہ سینٹ پال ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ تو اسی اسلام کے مبلغ تھے جو حضرت آدم سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر مکمل ہوتا ہے اس موجودہ عیسائیت سے حضرت عیسیٰ کا دور کا واسطہ بھی نہیں، یہ تو سینٹ پال کے یونانی فلسفۂ الٰہیات سے مرعوبیت کا کرشمہ ہے۔ غرض سینٹ پال کی عیسائیت نے کائنات میں انسان کی حیثیت کے بارے میں ایک اچھوتا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان ازل سے خطاکار ہے، اور دنیاوی لذات و مسرات بلکہ پوری دنیوی زندگی محض گناہ سے عبارت ہے، اس لئے جو شخص ان سے لطف اندوز ہوگا وہ آسمانی بادشاہت یعنی آخرت میں کوئی حصہ نہ پائے گا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ عیسائیت نے جب یہ محسوس کیا کہ دنیا کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں انسان اپنی جبلت سے مجبور ہے تو آسمانی بادشاہت سے بہرہ مند ہونے کیلئے کفارہ کے عقیدے کی ایجاد کر کے کس طرح اس نے انسان کو بالکل ہی اس کے اعمال کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔ بہرحال عیسائیت کی پیش کردہ انسان کی اس حیثیت کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ انسانی فطرت کے اقتضاء کا مقابلہ کر سکے۔ کیا یہ نظریہ انسان کو رہبانیت کے علاوہ بھی کسی اور راستے پر لے جا سکتا ہے؟ یا اس مشکل کے حل کے نتیجے میں عقیدہ کفارہ پر ایمان رکھ کر کیا انسان حیوانیت کی

انتہائی پستیوں میں گرنے سے کسی طور بھی بچ سکتا ہے۔؟ عیسائی دنیا کا یہ موجودہ اخلاقی دیوالیہ پن اسی نظریہ کا تو نتیجہ ہے اس نظریہ کی ناکامی دنیا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی ہے۔

یہ تو تھا اس سلسلہ میں اسلام کے علاوہ ان مذاہب کا حال جو دنیا کے بڑے مذاہب میں سرفہرست شمار ہوتے ہیں اب ذرا ایک نظر یہودیت پر بھی ڈالتے چلیں، گو تاریخی اعتبار سے تو یہودیت کا نمبر عیسائیت سے پہلے ہے مگر موجودہ مقام اور اہمیت کے لحاظ سے اس کا نمبر عیسائیت کے بعد ہی آتا ہے۔ یہودیت کے سلسلہ میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس کے مخاطبین صرف بنی اسرائیل ہیں یہ مذہب صرف بنی اسرائیل کیلئے ہے اور کوئی غیر بنی اسرائیل اس میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کائنات میں انسان کی حیثیت کا تعین بھی اس مذہب نے بطور بنی اسرائیل کے ایک فرد کے کیا ہے اور اس کی نظر میں بنی اسرائیل کیلئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے معافی کا اعلان کیا ہوا ہے، یہود کا عقیدہ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں اس لئے ہم سے کسی قسم کی پرسش ہی نہیں جنت ہے ہی صرف ہمارے لئے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ ابنٰوء اللہ واحباؤہ کے قائل ہیں۔ اس نظریہ کے اپنانے کے نتیجے میں اس قوم میں اعمال کی ذمہ داری کا احساس ہی مفقود ہو گیا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ یہ قوم تمام اخلاقی رذائل کا ایک مثالی نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ غور فرمائیے یہ نظریہ اس قوم کو اس کے سوا اور دے بھی کیا سکتا تھا۔ یہ نظریہ نسلی تعصب کا ایک نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کے لئے انتہائی ضرر رساں ہے۔

ان مذکورہ بالا مذاہب کے علاوہ چند فلسفہ ہائے زندگی اور ہیں جنہوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کائنات میں انسان کی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان فلسفہ ہائے زندگی کے علمبرداروں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ تو واقعی نہیں کیا مگر اس ایک بات کے علاوہ یہ فلسفے ایک مستقل مذہب کی دیگر تمام خصوصیات کے مالک ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی روشنی کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ان فلسفوں کے پھیلائے ہوئے اندھیروں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ان میں سے ایک گروہ کی نظر میں انسان اس دنیا میں صرف تھوڑی سی مدت کے لئے مزے اڑانے آیا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک کھاؤ پیو اور عیش کرو اسی کا نام زندگی ہے۔ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں، لہٰذا فکر کی کیا ضرورت۔ اس گروہ کی نظر میں انسان گویا دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے انسان کو ایک مجبور محض ہستی سمجھ رکھا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ فطرت کے قانون نے انسان کو اپنی گرفت میں لے

رکھا ہے نہ وہ اپنے کسی ارادہ کا مالک اور نہ کسی قسم کا عمل کرنے پر قادر۔ دوسرے لفظوں میں اس گروہ کی نظر میں انسان پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور اس لحاظ سے یہ گروہ انسان کو نباتات وجمادات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ایک تیسرا گروہ اور ہے جو زندگی کے ارتقائی تصور پر یقین رکھتا ہے اور انسان کو بقائے برتر کے قانون کا پابند ٹھہراتا ہے اسکی نظر میں انسان ایک معمولی ذرہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، وہ سمجھتا ہے کہ انسان کی ابتداء یک خلوی پودے سے ہوئی اور وہ نہ جانے کس کس قسم کے کیڑے مکوڑوں کے روپ دھارتا ہوا اور مچھلیوں اور بندروں کے جون بدلتا ہوا اس موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ یہ گروہ بھی دراصل انسان کو ایک میکانکی قانون کے سامنے ایک مجبور محض ہستی ٹھہراتا ہے اور اس کے کسی عمل کا اسے ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ غرض یہ اور اسی قسم کی دیگر فلسفیانہ موشگافیاں بھی کسی طرح انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور ان کی حقیقت اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ تمام مذاہب اور یہ تمام فلسفہ ہائے زندگی کائنات میں انسان کا صحیح مقام متعین کرنے سے عاجز رہے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

دراصل کائنات میں انسان کی حیثیت کے بارے میں ان تمام مذاہب و فلاسفہ کے یہ ناکام اور نامکمل نظریات نتیجہ ہیں اس حقیقت کا کہ ان سب نے انسانی زندگی کا محض ایک پہلو مدنظر رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نظریہ ایسا نہیں ہے جو ہر لحاظ سے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اور یہی بات شاہد ہے اس حقیقت پر کہ ان تمام مذاہب و فلسفیات کو انسانی عقل کی محدود سوچ نے جنم بخشا ہے۔

اب ان تمام نظریات کے مقابلہ میں ذرا دیکھئے اسلام اس کائنات میں انسان کو کیا مقام عطا کرتا ہے اور پھر ذرا موازنہ کر کے دیکھیئے کہ کیا اس سلسلہ میں اسلام ہی کا دیا ہوا نظریہ ایسا نظریہ نہیں ہے جو انسانی فطرت اور اسکی حقیقت کے عین مطابق ہے اور جس میں اس کائنات کی فطری روش کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اسلام کی نظر میں مظاہر فطرت کی شوکت وجبروت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری اور بے بسی ہی کو نہیں دیکھتیں اسکی ان وہبی قوتوں کو بھی جانتی ہیں جو اسے ان تمام مظاہر فطرت پہ شرف و بزرگی عطا کرتی ہیں۔ اور اسے اشرف المخلوقات جیسے بلند مقام پر فائز کرتی ہیں۔ اسلام کی نظر میں انسانی زندگی محض تکلیف اور رنج و الم ہی کا مرقع نہیں ہے بلکہ ان لمحات مسرت سے

بھی مالامال ہے جو انسان کو اس دنیا ہی میں جنت کی یاد دلا دیتی ہیں۔ اسلام انسان کی صرف مادی خصوصیات پر نظر رکھ کر اسے ازلی خطاکار نہیں ٹھہراتا، اسکی روح کی ان صلاحیتوں سے بھی واقف ہے جو اسے قرب خداوندی کی بلندیوں تک لے جاتی ہیں۔ اسی طرح اسلام نہ انسان کو محض عیش و عشرت کیلئے بالکل آزاد چھوڑتا ہے اور نہ کسی میکانکی قانون کا پابند بنا کر بالکل ہی ایک مجبور محض ہستی ٹھہراتا ہے وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر پوری نظر رکھتا ہے اور اس کے لئے اس کائنات میں ایک ایسا مقام متعین کرتا ہے جو اس کے شایان شان ہے اور اسکی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ یہ انسان دیگر تمام مخلوقات کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس کائنات میں رب العالمین کے ایک ذمہ دار نائب کی حیثیت کا مالک[1] ہے، اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اس کا تابع فرمان[2] ہے، وہ ان سب پر حاکم ہے اور اس کائنات کی تمام مخلوقات پر اسے عزت و شرف حاصل[3] ہے مگر یہ حکومت اور عزت و شرف اسے اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب وہ اس ہستی کا مطیع و فرمانبردار[4] ہے جسکی طرف سے نائب بن کر وہ اس دنیا میں آیا ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان اس کائنات کی ہر چیز پر حاکم ہے، مگر اپنے آقا کا محکوم ہو کر وہ اس کائنات کا فرمانروا ہے، مگر اس کائنات کے خالق کا تابع فرمان بن کر۔ اسلام کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ اسے اپنے تصرف میں لائے پھر اس تصرف میں وہ ان ہدایات پر کاربند رہے جو اسے وقتاً فوقتاً اپنے آقا کی طرف سے پہنچتی رہیں۔ اس تصرف میں وہ جیسے صحیح یا غلط عمل کریگا ویسے ہی اچھے یا برے نتائج مرتب ہوں گے جنکا اثر وہ اس دنیاوی زندگی کے بعد کی ایک اور زندگی میں[5] دیکھے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ انسان کو اپنی

---

[1] انی جاعل فی الارض خلیفۃ (البقرہ) ایک جگہ اسی بات کو یوں ارشاد فرمایا: وھو الذی جعلکم خلٰئف الارض (الانعام) [2] الم ترأن اللہ سخر لکم ما فی الارض (الحج)

[3] ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر (بنی اسرائیل)

[4] وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض۔

[5] ان الساعۃ آتیۃ اکاد اخفیھا لتجزیٰ کل نفس بما تسعیٰ (طٰہٰ) ایک اور جگہ ارشاد ہے: وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ۔

مختصر سی زندگی میں ہر لمحہ اس حقیقت کا احساس رہنا چاہئے کہ جو چیزیں اس کے آقا نے اپنے نائب کی حیثیت سے اس کے تصرف میں دی ہیں ان سب کا اس سے پورا پورا احساب[1] لیا جائے گا۔ اور چونکہ یہ نیابت کا منصب بنی نوع انسان کے ہر فرد کو علٰحدہ علٰحدہ مستقل طور پر حاصل ہے اس لئے ہر فرد اپنے اپنے طور پر اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہوگا کسی پر کسی دوسرے کے عمل کی جواب دہی کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ ولا تکسب کل نفس الا علیہا ولا تزروا زرۃ وزر اخری۔

اب اسلام کے عطا کردہ انسان کے اس منصب نیابت کو ذہن میں رکھئے اور ذرا غور کیجئے کہ انسان کو اس سے بہتر کوئی اور مقام اس کائنات میں عطا کیا جاسکتا ہے کیا یہی وہ مقام نہیں ہے جسکی تلاش میں تمام مذاہب فکر ٹھوکریں کھائی ہیں اور اسکو پانے میں ناکام رہے ہیں۔ کیا انسان کو عطا شدہ یہ منصب نیابت انسانی فطرت کے تمام تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی پوری طرح صلاحیت نہیں رکھتا، کیا کسی درجہ میں بھی یہ اس کائنات کے فطری اصولوں میں سے کسی اصول سے متصادم نظر آتا ہے آپ کو ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ملے گا۔ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی اطاعت کرے۔ اپنے آقا کی اطاعت سے وہ اگر انحراف کرتا ہے یا کسی اور کی اطاعت کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے تو وہ نائب نہیں باغی ہے۔ نائب کو اس بات کی بھی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کی رعیت کو اپنی رعیت بنالے۔ اسی طرح نائب اپنے آقا کی املاک میں تصرف تو کرسکتا ہے لیکن آقا کی حیثیت سے نہیں نائب کی حیثیت سے۔ ان ہدایات پر پورا پورا عمل کرتے ہوئے جو اس تصرف کے سلسلہ میں آقا کی طرف سے اسے ملیں نائب کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے اسے اپنے آقا کے سامنے ایک ایک پائی کا حساب دینا ہے۔ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہ کائنات کی تمام چیزوں سے افضل و اعلیٰ ہے اور اس لحاظ سے اس کائنات کی تمام چیزیں اس کے ماتحت ہیں اور ماتحتوں کے آگے جھکنا باعث ذلت ہے، مگر ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے آگے جھکنا اس کا فرض ہے اور وہ ہستی وہ ہے جس نے اسے اپنا نائب بنایا ہے، یعنی خدا۔ نائب کے لئے یہ بات

---

[1] والوزن یومئذ ن الحق فمن ثقلت موازینہ فاولٰئک ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولٰئک الذین خسروا انفسھم بما کانوا بآیٰتنا یظلمون (اعراف)

بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کائنات سے کوئی تعلق نہ رکھے اور اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر گوشہ نشین ہوجائے اگر ایسا کرے گا تو اپنے آقا کا نافرمان ٹھہرے گا۔ یہی ہیں وہ نکات کہ انکی حقیقت اگر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ انسان کے ذہن پر منکشف ہوجائے تو انسان اس کائنات میں اپنا اصل مقام پہچان لیتا ہے پھر اس کے نزدیک یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہوتی ہے وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ دنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہے اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتنے میں صرف کر دے تاکہ آخرت میں اسکی بہتر سے بہتر فصل کاٹے اس طرح اسکی قوت عملی روز بروز جلا پاتی رہتی ہے، وہ رہبانیت کا شکار نہیں ہو پاتا نیابت خداوندی کا تصور اسے دنیا میں پوری طرح منہمک رہنے اور دنیوی معاملات کو پوری سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داری کا خیال اور ایک دن اپنے آقا کے سامنے جواب دہ ہونے کی فکر اسے حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتی، وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے انتہا درجہ کا خوددار ہوتا ہے، مگر اسی نیابت کا تصور اسے متکبر ہونے سے بھی باز رکھتا ہے۔ وہ نیابت خداوندی کا فرض بحسن وخوبی انجام دینے کی خاطر ان تمام چیزوں کی طرف پوری رغبت رکھتا ہے جو اس کے فرض کی بجا آوری کے لئے ضروری ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان تمام چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے جو اسے دنیا کی لذتوں میں گم کرکے اس کے فرائض سے اسے غافل کردیں اور اسطرح اسلام کے پیش کردہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والا جب تک اس کائنات میں رہتا ہے نہ صرف یہ کہ اسکی فطری روش سے ہم آہنگ رہتے ہوئے اس سے پوری طرح بہرہ اندوز رہتا ہے بلکہ دن بدن اسکی رعنائیوں میں اضافہ کا موجب بنتا ہے اور جب اس کائنات میں اپنی مقررہ مدت پوری کرکے دوسری زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ تو ابدالآباد کی راحتوں اور لذتوں سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

تعارف کتب

ایڈیٹر کے قلم سے

انوار قاسمی جلد اوّل | از پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی ۔ لائل پور ــــ ناشر: ادارہ سعدیہ مجددیہ ۲۸ چیمبرلین روڈ لاہور ، صفحات ۵۰۰ ۔ قیمت بارہ روپیہ ۔ کتابت وطباعت عمدہ ۔

امام العصر سید الطائفہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف دار العلوم دیوبند کے بلکہ کتاب و سنت کی اساس پر ایک نئے علم کلام کے بھی موجد اور دین میں ایک راہ اعتدال قائم فرمانے کے بانی تھے ۔ انکی شخصیت عہد آفرین تھی ، علم و حکمت کے اس مینار کی ضیا پاشیوں سے ایک عالم منور ہوا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسکی ضو افشانیاں بھی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئیں ۔ ایسی نابغہ روزگار ذات کی شخصیت اور احوال و سوانح پر جتنا کچھ بھی اور جس رنگ و عنوان سے بھی تحقیقی کام ہو تو حق ادا نہیں ہو سکتا ۔ علوم و معارف قاسمی کی کما حقہٗ خدمت تو اب تک ایک عظیم دائرۃ المعارف کی منتظر ہے ۔ دیکھئے یہ سعادت کن ارواح سعیدہ کے حصہ میں آتی ہے حضرت نانوتوی رح کی بیشمار سوانح لکھی گئی ہیں ۔ صاحب دل اور صاحب قلم بزرگ حضرت علامہ گیلانی نے بھی جذب و سوز میں ڈوب کر اپنے البیلے انداز میں کئی ہزار صفحات کی گلکاری فرمائی ، مگر تحقیق اور ترتیب کے لحاظ سے اب تک سوانح پر کام کی گنجائش باقی تھی ، اس ضرورت کو مولانا انوار الحسن شیر کوٹی نے نہایت محنت ، عرقریزی اور تجسس و تحقیق سے پورا فرمایا ۔ پیش نظر ضخیم جلد میں صاحب سوانح رح کے ذاتی و خانگی حالات ۔ روحانی و علمی ، کسب اور ارتقاء پھر علمی ، معاشرتی ، سیاسی اور روحانی میدانوں میں حیرت انگیز اصلاحی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے ، جنہیں پڑھ کر یہ یقین اور بھی راسخ ہو جاتا ہے کہ حجۃ الاسلام رح اور ان کی تحریک دیوبند سے حق تعالیٰ نے اس صدی میں اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے لئے اصلاح و تجدید کا عظیم الشان کام لیا ۔ اگر دار العلوم دیوبند جامع المجددین ہے ، اور اس سے اکتساب فیض کرنے والوں میں بیشمار اکابر مقام تجدید پر فائز ، تو حجۃ الاسلام رح کی حیثیت بلاشبہ مجدد کامل اور فرد فرید کی ہے ۔

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

انوار قاسمی کی جلد اوّل میں بلاشبہ مؤلف نے نہایت مفید اور مستند مواد جمع فرمایا ہے ، مگر ہمیں اس سے بھی بڑھ کر خوشی اور اشتیاق جلد ثانی کا ہے جس میں مصنف نے حضرت والا رح کے علوم اور حکمت قاسمیہ کی عارفانہ مباحث کی حیثیت اور موجودہ دور میں اسکی افادیت و اہمیت اور تصانیف کے خصوصیات و

تعارف اور اس حکمت کے بنیادی اصول وفروع کی استدلالی نوعیت پر سیر حاصل بحث کا مژدہ دیا ہے۔ بلاشبہ یہ مؤلف کا ایک لاثانی کارنامہ ہوگا۔ حق تعالیٰ انہیں توفیق دے۔ سرسری مطالعہ کے دوران دو ایک چیزیں طبیعت میں کھٹک گئیں۔ صفحہ ۲۲ پر حقہ نوشی کے ضمن میں "سخن آفرینی" ذوقِ سلیم پر گراں گذرے گی۔ صفحہ ۲۰۹ پر باغ قاسمی کے سدا بہار ثمرات کے ضمن میں اجلہ اکابر کی فہرست میں اپنے آپ کو بھی شمار کرانا عجب نہ بھی ہو تو خلاف تواضع ضرور ہے۔ بعض مقامات سے مؤلف کا ایک خاص سیاسی ذہن جھلکتا نظر آتا ہے۔

صفحہ ۲۰۴ اور صفحہ ۲۰۷ اسکی واضح مثالیں ہیں۔ ایک محققانہ تالیف کیلئے ذاتی اور سیاسی نظریات کا عینک اتارنا ضروری ہوتا ہے ــــ ذاتی تاثرات اور خیالات کیلئے ایسی وقیع علمی کتاب کی بجائے کسی اخبار کا ایڈیٹوریل کالم مفید ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھارت سے شائع ہونے والی "انوار الباری" کے نام سے بخاری جیسی جلیل القدر کتاب کی شرح میں بھی ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ بہر حال یہ اکّا دکّا خامیاں تو ہر چیز میں ہوتی ہیں اور ایسی مفید جامع اور موثر کتاب کیلئے تو ایسی فروگذاشت نظر بد کا تعویذ بن جاتی ہے۔ خانوادہ قاسمی دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ چاہئے کہ وہ پورے ولولہ سے دستِ شوق بڑھا کر اس کتاب سے دل و دماغ کو معطّر کردے۔

<u>مجموعہ قوانین اسلام جلد ۳</u> | از جناب تنزیل الرحمان اعزازی مشیر قانون ادارۂ تحقیقات۔

ناشر: ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد ۔ قیمت ۱۵/- روپے

اتنے عرصہ میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے "شر" سے بحیثیت مجموعی اگر "خیر" کا کوئی پہلو ظاہر ہوا ہے تو وہ قوانین اسلام پر جناب تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ کا مجموعۂ قوانین ہے جسکی دو جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، تیسری جلد ہمارے سامنے ہے اور فاضل مؤلف نے نہایت عرق ریزی سے نسب اولاد، حضانت، نفقہ اولاد و آباء و اجداد، ہبہ اور وقف پر اسلامی دفعات مرتب کی ہیں۔ مؤلف نہ صرف فقہ اسلامی کے تمام مکاتب فکر پر بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں قانون کے ارتقائی پہلوؤں اور جدید قانونی نظریات پر بھی وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ اور الحمد للہ کہ ایسے مواقع پر ان کا تقابلی مطالعہ انہیں غیر اسلامی قوانین پر اسلامی قوانین کی افادیت اور عظمت و فوقیت کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ مصنّف کا طریقہ یہ ہے کہ قوانینِ اسلامی کو دفعہ وار شکل میں مرتب کر کے فقہائے اربعہ بلکہ شیعہ امامیہ اور ظاہریہ تک کے مذاہب کی روشنی میں اسکی تشریح کرتے ہیں پھر ممالک اسلامیہ میں مروجہ قوانین کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ اور آخر میں پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلہ کا ذکر کرتے ہوئے اگر ان میں کوئی خلاف شرع نقص ہو تو اسکی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ کتاب کا تفصیلی مطالعہ کر کے بعض مقامات سے جزوی اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ پچھلی دو جلدوں کی بعض

فروگذاشتوں پر اہل علم نے تنبیہ کی ہے یہ مجموعہ بہرحال اسلامی قانون کی تدوین و ترتیب کیلئے ایک بہترین مثال ہے اور جو لوگ اسلام کو ناقابل عمل گردانتے ہیں ان کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ ہے جو انہیں کے گھر میں انہیں رسید کیا گیا ہے۔ اور اس طرح شھد شاھد من اھلہا کا ایک اور ظہور اس کتاب کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس کتاب نے اہل علم اور عدالتوں اور وکلاء کیلئے اسلامی قوانین اور مذاہب فقہیہ تک رسائی آسان کر دی ہے۔ اس سے کسی مسئلہ میں مختلف مکاتیب فکر کے نقطہ ہائے نظر بھی یکجا معلوم ہو جاتے ہیں اور بہت آسانی سے فقہی مذاہب کا موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

سیدنا عثمان بن عفان رضؓ | محمد نصیر ہمایوں صاحب۔ قیمت ۳/ روپے صفحات ۱۲۰

بیگم ہمایوں ٹرسٹ ریلوے روڈ لاہور۔

شہید دار امام مظلوم داماد نبی کریم حضرت عثمان کا مقام اللہ اور رسول کی نظر میں کیا ہے۔؟ کتاب پڑھ کر اندازہ لگائیے اور ان لوگوں کی جسارت، بے حیا اور خیرہ چشمی کی داد دیجئے جنہوں نے عثمان ذی النورینؓ کے دامن عفت و حیا کو داغدار کرنا چاہا اور اللہ اور اس کے رسول کے واضح ارشادات کا منہ چڑایا۔ فاضل مؤلف نے فضیلت عثمانؓ پر بہترین اور مستند مواد جمع فرمایا تاکہ غیر متعصب مسلمان انہیں حقیقی رنگ میں دیکھ سکیں۔ بیگم ہمایوں ٹرسٹ کا تبلیغی پروگرام بہت خوشی کا باعث ہے۔

دفاع پاکستان کی لازوال داستان | از جناب بریگیڈیر گلزار احمد صاحب راولپنڈی۔ قیمت ۱۵/ روپے صفحات ۴۳۴ ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

ناشر: مکتبۃ المختار - ۴ الف ، گلستان ، ایوب پارک ، راولپنڈی

جناب بریگیڈیر صاحب نہ صرف صاحب سیف و سنان ہیں بلکہ اللہ نے انہیں ایک حد تک قلم اور ملک و ملت کے لئے دینی شعور اور ملی جذبات سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ ۱۹۶۵ء پاکستان کے لئے ایک نازک امتحان کا وقت تھا۔ پاکستانی افواج اور ملت مسلمہ اس نازک گھڑی میں کامیاب ہو گئی۔ بریگیڈیر صاحب خود صاحب واقعہ اور شریک رزم تھے، اس موقع پر شجاعت و ہمت، جہاد و عمل، ایمان و یقین، جوش اور ولولۂ ایمانی کے جو لازوال اور ایمان آفرین واقعات ظہور میں آئے وہ ہمیشہ کیلئے پاکستانی قوم کیلئے ایک سبق ہیں۔ بریگیڈیر صاحب نے پیش نظر کتاب میں بڑی محنت اور تلاش سے ایسے واقعات کو جمع کر کے ایک ایسا حسین گلدستہ بنا کر پیش کیا ہے جو خون شہداء کی طرح دمک رہا ہے۔ مورخ کا کام زیر تحریر واقعہ کے متعلق تمام روایات جمع کرنا ہوتا ہے۔ مگر مؤلف چشم دید گواہ ہیں اس لئے درایت کی کسوٹی پر کتاب پرکھی جائے گی تو ناقابل اعتبار اور غیر ثقہ روایات دیگر ایسے مجموعوں کی بہ نسبت کم ہی نکلیں گی۔

نتیجۂ امتحانات شرکاء دورۂ حدیث ۱۳۸۹ھ دارالعلوم حقانیہ ملحقہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

کل نمبر ۶۰۰ کامیاب درجہ علیا ۳۶۰ یا اس سے زائد کامیاب درجہ وسطیٰ ۳۰۰ یا اس سے زائد۔ کامیاب درجہ ادنیٰ ۲۴۰ یا اس سے زائد - صرف کامیاب طلباء کا نتیجہ درج ذیل ہے ر۱۲ ر۵۳ کو بخاری اور ر۳۶ ر۴۲ کو ترمذی میں دوبارہ امتحان دینا ہوگا۔

رول نمبر	نام طالب علم	حاصل کردہ نمبر	رول نمبر	نام طالب علم	حاصل کردہ نمبر
۱	مولوی عبدالجلیل بن حشم گل	۳۲۶	۲۴	مولوی نورالحق بن مولوی یاسین	۲۹۰
۲	" داد اللہ بن محمد ولی	۳۵۲	۲۵	" محمد وصیل بن عبدالحق	۳۸۹
۳	" عبدالاحد بن عبدالحمید	۳۳۱	۲۶	" زرقلم خان بن حاجی بادشاہ خان	۳۵۱
۴	" فتح الرحمٰن بن گل رحمان	۳۲۰	۲۷	" نجم الدین بن بخت جمال	۳۷۴
۵	" عبدالعزیز بن جمعہ خان	۲۷۴	۲۸	" محمد علی شاہ بن سردار علی شاہ	۳۳۸
۶	" احسان الحق بن امیر گلاب	۲۴۱	۲۹	" میر سیدی جان بن محمد جان	۲۴۱
۷	" حبیب محمد بن عبدالکبیر	۳۳۹	۳۰	" عبدالقیوم بن مصلح الدین	۲۴۹
۸	" محمد یوسف بن محمد گل	۲۹۵	۳۱	" نواز علی خان بن محمد حلیم	۳۱۳
۹	" حضرت محمد بن محمد حسین	۲۹۷	۳۲	" گلفراز بن یوسف خان	۲۸۶
۱۰	" عبدالشکور بن عبدالقدوس	۳۳۸	۳۳	" شمس الدین بن سرملی	۲۵۸
۱۱	" محمد گل بن محمد علم	۲۵۸	۳۴	" محمد اعظم بن محمد گل	۳۸۴
۱۲	" عبدالستار بن حاجی محمد عمر	۲۵۲	۳۵	" عطاء اللہ بن حبیب اللہ	۲۵۹
۱۳	" نعمت اللہ بن رحیم اللہ	۳۳۳	۳۶	" عبدالحنان بن عبدالقیوم	۲۶۷
۱۴	" فضل واحد بن عبدالغفور	۳۶۴	۳۷	" عبدالمتین بن فضل احمد	۳۲۶
۱۵	" شمس العابدین بن صاحبزادہ محمد یوسف	۲۹۸	۳۸	" محمد عمر بن محمد قاسم	۳۳۶
۱۶	" عبیداللہ بن الحسن	۳۷۲	۳۹	" بادشاہ زمین بن خان زرین	۳۷۳
۱۷	" شیر اللہ بن حاجی محمد یوسف	۳۶۶	۴۰	" محمد عیسیٰ بن محمد موسیٰ خان	۳۲۴
۱۸	" اسلام الدین بن مرجان	۲۴۰	۴۱	" نور محمد بن لعل محمد	۳۴۳
۱۹	" عبیداللہ بن میر دار	۲۴۱	۴۲	" احمد شاہ بن مولوی عبدالقیوم	۴۱۳
۲۰	" عبدالقدوس بن محمد ایوب	۲۹۷	۴۳	" سعدالرشید بن حافظ محمد سعادت شاہ	۴۱۶
۲۲	" محمد غوث بن محمد عثمان	۲۷۸	۴۴	" محمد نسیم بن فضل حکیم	۲۸۹

رول نمبر	نام طالب علم	حاصل کردہ نمبر
۴۵	مولوی عبدالحکیم بن عبدالغنی	۳۵۲
۴۶	〃 غلام حبیب بن جمع دین	۲۴۹
۴۷	〃 محمد فیروز خان بن دوا خان	۲۵۰
۴۸	〃 عبدالودود بن راصیت شاہ	۲۸۱
۴۹	〃 امیر تیمور شاہ بن جالندھر شاہ	۲۵۲
۵۰	〃 بشیر احمد عرف بشیر گل بن گلام الدین	۲۸۳
۵۱	〃 شیر علی بن عبدالکریم	۲۵۴
۵۲	〃 محمد اسماعیل بن محمد حنین	۲۷۴
۵۳	〃 محمد شریف بن محمد صعقدر	۲۵۳
۵۴	〃 مرزا محمد بن فتح محمد	۲۸۲
۵۶	〃 غلام نبی بن دین باؤ	۲۷۴
۵۷	〃 فضل سبحانی بن گل زدین	۲۴۹
۵۸	〃 عبیداللہ بن حاجی لعل کریم	۳۸۰
۵۹	〃 محمد ظاہر شاہ بن فضل الرحمن	۳۱۹
۶۰	〃 عبدالغفور بن ملک ملا	۳۵۹
۶۱	〃 سراج الدین بن باز گل	۳۱۲
۶۲	〃 محمد سلام بن محمد کلام	۲۴۱
۶۳	〃 عبدالودود بن محمد اسحاق	۲۷۵
۶۴	〃 عنایت اللہ بن مولوی محمد رضا	۳۵۶
۶۵	〃 عبداللطیف بن فقیر محمد	۲۶۳
۶۶	〃 نور محمد بن گل رحمان	۳۱۹
۶۹	〃 عبدالرحیم بن ملا تحداثے رحم	۲۷۲
۷۰	〃 محمد مزمل بن رحمت گل	۲۵۰
۷۱	〃 فضل مولیٰ بن عبداللہ	۳۲۳
۷۲	مولوی عماد الدین بن ابوسعید	۲۹۰
۷۳	〃 امیر محمد بن عبدالغنی	۲۵۱
۷۴	〃 دلارام خان بن سید محمود	۲۷۴
۷۵	〃 ضیاء الحق بن رضا خان	۲۵۵
۷۶	〃 نیاز الرحمن بن معیش الدین	۲۸۲
۷۷	〃 نعمت گل بن محمد شاہ	۲۵۸
۷۸	〃 رحمت شاہ بن عالم شاہ	۲۹۰
۷۹	〃 نور الحق بن پیر سید	۲۵۷
۸۰	〃 خان ولی بن محمد ولی	۲۶۷
۸۱	〃 عبدالاحد بن ملا عبداللہ جان	۲۳۸
۸۲	〃 گل بخت بن ملا جلاد	۳۱۵
۸۳	〃 اکرام اللہ بن عبداللہ جان	۲۹۳
۸۵	〃 عبدالغنی بن صحبت خان	۲۹۸
۸۶	〃 نور الحق بن جار اللہ	۳۰۸
۸۸	〃 شریف احمد بن قاضی عبدالکبیر	۲۶۷
۸۹	〃 محب اللہ بن عبداللہ	۲۶۷
۹۰	〃 عبداللہ بن مولانا عبدالخالق	۳۲۷
۹۱	〃 عزیز الرحمن بن خائستہ خان	۲۸۳
۹۲	〃 محمد گل بن جہان شاہ	۲۷۳

بادِ صبا سے
جانِ صبا تک